تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہنامہ مفاہیم کراچی

فروری ۲۰۲۲ء

جلد ۲ — فقہ اکیڈمی کا ترجمان — شمارہ ۳

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

ليتفقهوا في الدين

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلی

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب

مدیر

صوفی جمیل الرحمن عباسی

نائب مدیر

حافظ حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

• حافظ محمد موسی بھٹو صاحب

• ڈاکٹر محمد رشید ارشد • مفتی اویس پاشا قرنی

• مولانا معراج محمد • حافظ سید اسامہ علی

• استاذ ابرار حسین • استاذ عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

مضامین

نعت	کہاں میں کہاں مدحِ ذاتِ گرامی	اقبال عظیم	۴
اداریہ	شجر کاری صدقۂ جاریہ	مدیر	۷
درسِ قرآن	سورۂ یونس، آیت: ۵۷۔۵۸	مولانا محمد اقبال	۱۱
درسِ حدیث	حدیثِ مزارعت	ابنِ عباس	۱۶
مقالات	حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف: تجزیہ و تعارف (۱)	مولانا نایاب حسن قاسمی	۱۹
	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۸)	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۲۸
	سفرنامۂ ترکی (۱)	مولانا حماد احمد ترک	۴۱
یسئلونک	آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سماع صلاۃ و سلام کے حوالے سے اہل سنت والجماعت کا موقف	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۴۶
ادبیات	اَوقافی علامات	نصیر ترابی	۴۸
	نظم: اے وادیٔ کشمیر	شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی	۵۰

اقبالؔ عظیم (۱۹۱۳ـ۲۰۰۰ء)
معروف شاعر

کہاں میں کہاں مدح ذاتِ گرامی

کہاں میں کہاں مدحِ ذاتِ گرامی
میں سعدیؔ، نہ رومیؔ، نہ قدسیؔ، نہ جامیؔ
پسینے پسینے ہوا جا رہا ہوں
کہاں یہ زباں اور کہاں نامِ نامی

سلام اس شہنشاہِ ہر دو سرا پر
درود اس امامِ صفِ انبیا پر
پیامی تو بے شک سبھی محترم ہیں
مگر اللہ اللہ خصوصی پیامی

فلک سے زمیں تک ہے جشنِ چراغاں
کہ تشریف لاتے ہیں شاہِ رسولاں
خوشا جلوہِ ماہتابِ مجسّم
زہے آمدِ آفتاب تمامی

کوئی ایسا ہادی دکھا دے تو جانیں
کوئی ایسا محسن بتا دے تو جانیں
کبھی دوستوں پر نظر احتسابی
کبھی دشمنوں سے بھی شیریں کلامی

اطاعت کے اقرار بھی ہر قدم پر
شفاعت کا اقرار بھی ہر نظر میں
اصولاً خطاؤں پہ تنبیہ لیکن
مزاجاً خطاکار بندوں کے حامی

یہ آنسو جو آنکھوں سے میری رواں ہیں
عطاے شہنشاہِ کون و مکاں ہیں
مجھے مل گیا جامِ صہباے کوثر
مرے کام آئی مری تشنہ کامی

فقیروں کو کیا کام طَبل و عَلَم سے
گداؤں کو کیا فکر جاہ و حشَم کی
عباؤں قباؤں کا میں کیا کروں گا
عطا ہو گیا مجھ کو تاجِ غلامی

انھیں صدقِ دل سے بُلا کے تو دیکھو
ندامت کے آنسو بہا کے تو دیکھو
لیے جاؤ اقبالؔ نامِ محمدؐ
شفاعت کا ضامن ہے اسمِ گرامی

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

* * * * *

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

شجر کاری صدقۂ جاریہ

شجر کاری یا زراعت ایک انسانی ضرورت تو ہے ہی لیکن ایک مسلمان کے لیے یہ اللہ کی نشانی اور نیکی بھی ہے۔ نیکیوں کی بابت دین کی اصولی تعلیم «لاَ يَحْقِرَنَّ أَحَدُكُمْ شَيْئًا مِنَ الْمَعْرُوفِ» (سنن ترمذی) "تم میں سے کوئی بھی کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھے" کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ہماری رو بہ زوال معیشت اور بڑھتی ہوئی مہنگائی اور غربت کا کسی قدر مداوا، زراعت اور باغبانی سے ممکن ہے۔ ہم کھیتی باڑی اور شجر کاری کے بارے میں چند احادیث پیش کرنا چاہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا إِلَّا كَانَ مَا أُكِلَ مِنْهُ لَهُ صَدَقَةً، وَمَا سُرِقَ مِنْهُ لَهُ صَدَقَةٌ، وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ مِنْهُ فَهُوَ لَهُ صَدَقَةٌ، وَمَا أَكَلَتِ الطَّيْرُ فَهُوَ لَهُ صَدَقَةٌ، وَلَا يَرْزَؤُهُ أَحَدٌ إِلَّا كَانَ لَهُ صَدَقَةٌ» (صحیح مسلم) "کوئی بھی مسلمان کوئی باغ (یا باغیچہ) لگائے تو اس میں سے جتنا کچھ فصل کھائی جائے گی وہ اس کے لیے صدقے کا ثواب ہے اور اگر کوئی اس میں سے چوری کرلے تو اس کے لیے صدقہ ہے اور جو کوئی درندہ کھالے تو اس کا بھی صدقہ ہے اور جو کوئی پرندہ کھالے اس کا بھی صدقہ ہے اور اس کے باغ میں کوئی بھی چیز کچھ کمی کرلے تو اس کے لیے صدقے کا ثواب ہے"۔ نبی اکرم ﷺ سیدہ امِ معبد رضی اللہ عنہا کے باغ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے سوال کیا: «يَا أُمَّ مَعْبَدٍ، مَنْ غَرَسَ هَذَا النَّخْلَ؟ أَمُسْلِمٌ أَمْ كَافِرٌ؟» "اے امِ معبد، کھجور کے یہ درخت کس نے لگائے ہیں؟ کسی مسلمان نے یا کسی کافر نے"؟ انھوں نے عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ! کسی کافر نے نہیں بلکہ ایک مسلمان نے لگا کر دیے ہیں"۔

آپ ﷺ نے فرمایا:«فَلَا يَغْرِسُ الْمُسْلِمُ غَرْسًا(وَلَا يَزْرَعُ زَرْعًا)فَيَأْكُلَ مِنْهُ إِنْسَانٌ،وَلَا دَابَّةٌ،وَلَا طَيْرٌ،وَلَا شَيْءٌ إِلَّا كَانَ لَهُ صَدَقَةً إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ» (رواه مسلم في روايتين عن جابر) ”کوئی بھی مسلمان کوئی باغ لگائے یا کوئی کھیتی اگائے پھر اس میں سے کوئی انسان کھالے یا کوئی جانور، پرندہ یا کوئی اور مخلوق کھالے تو اس باغ لگانے والے کے لیے قیامت کے دن تک صدقے کا اجر و ثواب ہے“۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ دمشق میں باغ لگا رہے تھے۔ کسی نے ان سے کہا: آپ صحابیٔ رسول ہو کر باغ لگا رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: دیکھو جلدی نہ کرو، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا:«مَنْ غَرَسَ غَرْسًا لَمْ يَأْكُلْ مِنْهُ آدَمِيٌّ،وَلَا خَلْقٌ مِنْ خَلْقِ اللهِ إِلَّا كَانَ لَهُ بِهِ صَدَقَةٌ» ”جس نے کوئی باغ لگایا تو اس میں کوئی آدمی یا اللہ کی کوئی اور مخلوق کچھ کھائے گی تو اس کو صدقے کا اجر ملے گا“۔ (مسند احمد) ایک روایت میں آتا ہے کہ کچھ لوگ آپ کے پاس دین کا کوئی علم سیکھنے گئے لیکن ان کو باغ لگاتا ہوا پایا۔ انھوں نے کہا: يَا أَبَا الدَّرْدَاءِ أَنْتَ صَاحِبُ رَسُولِ اللهِ ﷺ،وَأَنْتَ مُقْبِلٌ عَلَى الدُّنْيَا ”اے ابوالدرداء! آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہو کر دنیا کے پیچھے پڑے ہیں؟“، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے سنا:«مَنْ غَرَسَ غَرْسًا أَجْرَى اللهُ لَهُ أَجْرَ مَنْ أَكَلَ مِنْهُ نَاسٌ أَوْ طَائِرٌ أَوْ دَابَّةٌ حَتَّى يَيْبَسَ» ”جس (مسلمان) نے کوئی باغ لگایا، اللہ اس باغ میں سے کھانے والوں کے بقدر اسے اجر سے نوازے گا، چاہے کوئی انسان کھائے، کوئی پرندہ یا کوئی اور جانور، یہاں تک کہ یہ باغ سوکھ جائے“۔ (مسند الشاميين للطبراني) حضرت ابو ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:«مَا مِنْ رَجُلٍ يَغْرِسُ غَرْسًا إِلَّا كَتَبَ اللهُ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ قَدْرَ مَا يَخْرُجُ مِنْ ثَمَرِ ذَلِكَ الْغَرْسِ» ”کوئی بھی (مسلمان) آدمی کوئی باغ لگاتا ہے تو اس کے پھل کے برابر اس کے لیے اجر لکھا جاتا ہے“۔ (مسند احمد) معاذ بن انس الجہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:«مَنْ بَنَى بُنْيَانًا مِنْ غَيْرِ ظُلْمٍ،وَلَا اعْتِدَاءٍ،أَوْ غَرَسَ غَرْسًا فِي غَيْرِ ظُلْمٍ،وَلَا اعْتِدَاءٍ،كَانَ لَهُ أَجْرٌ جَارٍ مَا انْتُفِعَ بِهِ مِنْ خَلْقِ اللهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى» (مسند احمد) ”جو شخص کوئی عمارت

بنائے بغیر کسی ظلم وزیادتی کے یا کوئی باغ لگائے بغیر ظلم وزیادتی کے تو اس کے لیے اجر جاری رہے گا، جب تک خلقِ خدا اس سے فائدہ اٹھاتی رہے"۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنْ قَامَتِ السَّاعَةُ وَبِيَدِ أَحَدِكُمْ فَسِيلَةٌ، فَإِنْ اسْتَطَاعَ أَنْ لَا يَقُومَ حَتَّى يَغْرِسَهَا فَلْيَفْعَلْ» "اگر قیامت قائم ہوجائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کا ایک چھوٹا پودا ہو اور اسے یہ طاقت ہو کہ اسے لگا سکے تو وہ ضرور ایسا ہی کرے"۔ (مسند احمد) الساعہ سے مراد قیامت بھی ہوسکتی ہے اور اس کی نشانیاں بھی جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے: «إِذَا سَمِعَ أَحَدُكُمْ بِالدَّجَّالِ، وَفِي يَدِهِ فَسِيلَةٌ فَلْيَغْرِزْهَا، فَإِنَّ لِلنَّاسِ عَيْشًا بَعْدُ»۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ اخروٹ کا پودا لگا رہے تھے کہ ایک آدمی آپ کے پاس سے گزرا اور آپ سے کہنے لگا آپ بہت بوڑھے ہو چکے اور اس بڑھاپے میں اخروٹ لگا رہے ہیں جبکہ کل نہیں تو پرسوں آپ انتقال کرنے والے ہیں اور آپ جانتے بھی ہیں کہ اخروٹ بہت سالوں بعد پھل دیتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وَمَا عَلَيَّ أَنْ يَكُونَ لِي أَجْرُهَا، وَيَأْكُلُ مَهْنَأَهَا غَيْرِي۔ "مجھے کوئی پروا نہیں کہ اجر تو مجھے ملتا رہے اور اس درخت کا پھل کوئی دوسرا کھاتا رہے"۔ (شرح السنہ للبغوی) فَنَّج ایک کسان پیشہ آدمی تھے جو دِینَباذ کے باغات میں کام کاج کیا کرتے تھے۔ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے علاقے میں آئے۔ جن میں سے ایک صحابی اِن کے باغ میں آئے جبکہ فَنَّج باغ کو پانی لگا رہے تھے۔ ان صحابی کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی جس میں سے وہ اخروٹ نکال کر کھا رہے تھے۔ وہ کھیت میں ایک جگہ بیٹھ گئے اور انھوں نے فَنَّج سے پوچھا: "کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں اخروٹ کا یہ بیج اس زمین میں لگا دوں؟"، فنج نے کہا: "ٹھیک ہے آپ بیج لگائیں لیکن مجھے اس کا کیا (دینی) فائدہ ہوگا؟"۔ اس پر ان صحابی نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: «مَنْ نَصَبَ شَجَرَةً فَصَبَرَ عَلَى حِفْظِهَا وَالْقِيَامِ عَلَيْهَا حَتَّى تُثْمِرَ كَانَ لَهُ فِي كُلِّ شَيْءٍ يُصَابُ مِنْ ثَمَرَتِها صَدَقَةٌ عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ» "جو شخص ایک درخت لگائے اور اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کرے، یہاں تک کہ وہ درخت پھل دینے لگے تو اس پھل سے جتنا بھی کوئی فائدہ اٹھائے گا، اسی قدر اِس (درخت لگانے والے یا حفاظت کرنے والے) شخص کے لیے صدقہ

لکھا جائے گا“۔ فَنَّجؓ نے انھیں اجازت دی اور انھوں نے باغ میں اخروٹ کا بیج لگایا۔ بعد میں فَنَّجؓ بتایا کرتے تھے کہ اس علاقے کے اخروٹ انھی صحابی کے بیج سے چلے ہیں“۔(مسند احمد) حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:«النَّخْلُ وَالشَّجَرُ بَرَكَةٌ عَلَى أَهْلِهِ،وَعَلَى عَقِبِهِمْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِذَا كَانُوا لِلَّهِ شَاكِرِينَ» ”کھجور اور (دیگر) درخت اپنے لگانے والے اور بعد والوں کے لیے باعثِ برکت ہے جب تک وہ اللہ کے شکر گزار رہیں“۔(المعجم الکبیر للطبرانی) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے بیٹوں کو مشورہ دیا کہ:«أَنْ يَحْرُثُوا الْقَضْبَ،فَإِنَّهُ يَنْفِي الْفَقْرَ» (المعجم الکبیر) ”سبزیاں کاشت کرو، پس وہ غریبی کو ختم کرتی ہیں“۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:«سَبْعَةٌ يَجْرِي لِلْعَبْدِ أَجْرُهُنَّ وَهُوَ فِي قَبْرِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ:مَنْ عَلَّمَ عِلْمًا،أَوْ أَجْرَى نَهَرًا،أَوْ حَفَرَ بِئْرًا،أَوْ غَرَسَ نَخْلًا،أَوْ بَنَى مَسْجِدًا،أَوْ وَرَّثَ مُصْحَفًا،أَوْ تَرَكَ وَلَدًا يَسْتَغْفِرُ لَهُ بَعْدَ مَوْتِهِ» ”سات چیزوں کا اجر بندے کی موت اور اس کے قبر میں جانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ جس نے کسی کو کوئی علم سکھایا یا کوئی نہر جاری کرائی یا کوئی کنواں کھُدوایا یا کھجور (یا کسی اور پھل) کا باغ لگوایا یا کوئی مسجد بنوائی یا کسی کو مصحف دلایا یا نیک اولاد چھوڑ گیا جو اس کے پیچھے دعاے مغفرت کرتی ہو“۔ (صحیح الترغیب والترھیب)

یہ تو تھی دنیا کے باغیچوں کی اہمیت۔ کچھ تذکرہ آخرت کے باغیچوں کا بھی ہونا چاہیے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ باغ لگا رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ وہاں سے گزرے، پوچھا: ”کیا کر رہے ہو؟“ انھوں نے عرض کی: باغ لگا رہا ہوں۔ فرمایا: ”میں اس سے بہتر باغ لگانا نہ سکھا دوں؟“ عرض کیا: یا رسول اللہ! ضرور بتایئے۔ فرمایا: ”سُبْحَانَ اللهِ،وَالْحَمْدُ لِلَّهِ،وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ،وَاللهُ أَكْبَرُ پڑھا کرو، ہر جملے کے بدلے تمھارے لیے جنت میں ایک درخت لگا دیا جائے گا“۔(سنن ابنِ ماجہ)

****

مولانا محمد اقبال
رکن شعبہ تحقیق و تصنیف

سورۃ یونس، آیت: ۵۷-۵۸

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ○ قُلْ بِفَضْلِ اللهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾

”لوگو تمھارے پاس ایک ایسی چیز آئی ہے جو تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک نصیحت ہے، اور دلوں کی بیماریوں کے لیے شِفا ہے، اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا سامان ہے۔ (اے پیغمبر) کہو: یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوا ہے، لہذا اسی پر تو انھیں خوش ہونا چاہیے، یہ اس تمام دولت سے کہیں بہتر ہے جسے یہ جمع کر کر کے رکھتے ہیں“۔

تفسیر و توضیح

مذکورہ آیات میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی ایک ایسی کتاب ہے جو نصیحت، شفا، ہدایت اور رحمت جیسے فوائدِ عظیمہ کی جامع اور پروردگار کی طرف سے لوگوں کے لیے عظیم الشان نعمت ہے۔ لہذا لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے ممکن ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے انھیں ہدایت دی اور انھیں دین حق یعنی اسلام عطا فرمایا۔ بلا شبہ اسلام جس کی طرف انھیں بلایا جا رہا ہے اور قرآن جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمایا ہے دنیا کی چند روزہ رونق سے کہیں بہتر ہیں، اسی پر تو انھیں خوش ہونا چاہیے۔ یہاں اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایک آفاقی حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے

فضل ورحمت ہی کو خوشی کی اصل چیز سمجھیں، دنیا کی چند روزہ راحت و عزت اور مال و دولت خوش ہونے کی چیز نہیں کیونکہ یہ جتنی بھی زیادہ ہو مگر بالآخر اسے زوال کا سامنا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تمام مال و دولت اور دنیاوی سلطنت و وجاہت جنھیں انسان اپنے لیے زندگی کا سرمایہ سمجھتا ہے سے بدرجہا بہتر و برتر ہے، کیونکہ رحمت خداوندی ایک دائمی نعمت ہے جو نہ ختم ہونے والی ہے اور نہ ہی زائل ہونے والی ہے۔

﴿وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ﴾ ”اور دلوں کی بیماریوں کے لیے شِفا ہے“۔ مذکورہ آیات میں پہلی آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”لوگو! تمھارے پاس ایک ایسی چیز آئی ہے جو تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک نصیحت ہے، اور دلوں کی بیماریوں کے لیے شِفا ہے“۔ یعنی قرآن کریم نصیحت ہے اور دل کی بیماریوں کے لیے شِفا ہے، اسی کے ذریعے دلوں کے امراض مثلاً کینہ، ریا، حسد، بغض، تکبر اور عقائد باطلہ جیسے شرک وغیرہ سے شِفا نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ تفسیر سعدی میں اس کی تفسیر یوں کی گئی ہے: ﴿وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ﴾ وهو هذا القرآن، شفاء لما في الصدور من أمراض الشهوات الصادة عن الانقياد للشرع وأمراض الشبهات القادحة في العلم اليقيني (تيسير الكريم الرحمن في تفسير كلام المنان، ص:٣٦٦، الناشر: مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، ١٤٢٠ھ) ”اور یہ قرآن شفا ہے دلوں کے لیے ان نفسانی خواہشات و شہوات کے امراض سے جو رکاوٹ بنتے ہیں شریعت کے سامنے سر جھکانے میں اور اسی طرح شبہات کے امراض سے جو علم یقینی میں شکوک پیدا کرتے ہیں“۔ اسی طرح تفسیر بغوی میں اس کی تفسیر فرمائی گئی ہے: ﴿وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ﴾ أي: دواء لما في الصدور من داء الجهل، وقيل: لما في الصدور، أي: شفاء لعمى القلوب. (تفسير البغوي، ج:٢، ص:٤٢٣، الناشر :دار إحياء التراث العربي بيروت، الطبعة الأولى :١٤٢٠ھ) ”اور یہ قرآن شفا ہے دلوں کے لیے“ یعنی دلوں میں جو جہالت ہے یہ اس کا علاج ہے۔ اور اس کی تفسیر میں یہ قول بھی اختیار کیا گیا ہے کہ شفا کا مطلب ہے قرآن دلوں کے اندھے پن کے لیے علاج ہے۔

﴿وَ هُدًى وَّ رَحمَةٌ لِّلمُؤمِنِينَ﴾ ”اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا سامان ہے“۔یہاں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم اہل ایمان کے لیے ہدایت اور رحمت کا ذریعہ ہے یعنی اس میں لوگوں کے لیے وعظ و نصیحت، ترغیب و ترہیب اور وعدو وعید ہیں جو بندوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں۔اسی طرح قرآن ایک ایسا نور ہے جس کے ذریعے انسان حق اور باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے متّصف ہوجاتا ہے۔

صاحب تفسیرِ بغوی فرماتے ہیں:وهدى من الضلالة، ورحمة للمؤمنين، والرحمة هي النعمة على المحتاج، فإنه لو أهدى ملك إلى ملك شيئا،لا يقال قد رحمه، وإن كان ذلك نعمة فإنه لم يضعها في محتاج (تفسير البغوي، ج:۲،ص:۴۲۳) ”قرآن کریم ہدایت ہے گمراہی سے اور اہل ایمان کے لیے رحمت ہے، جبکہ رحمت ایسے انعام کو کہتے ہیں جو ایسے شخص پر کیا جائے جو اس کا محتاج ہو، اس لیے کہ اگر کوئی بادشاہ کسی دوسرے بادشاہ کو کوئی چیز ہدیہ کرتا ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے دوسرے بادشاہ پر رحم کیا، اگرچہ یہ بھی انعام ہے مگر اس نے محتاج پر نہیں کیا اس لیے اسے رحمت نہیں کہیں گے“۔مذکورہ آیت مبارکہ کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقام سورۂ بنی اسرائیل میں کی گئی ہے، ارشادِ ربانی ہے:﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا﴾ ”اور ہم وہ قرآن نازل کر رہے ہیں جو مؤمنوں کے لیے شفا اور رحمت کا سامان ہے، البتہ ظالموں کے حصے میں اس سے نقصان کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہیں ہوتا“۔

﴿قُل بِفَضلِ اللّٰهِ وَ بِرَحمَتِهِ فَبِذٰلِكَ فَليَفرَحُوا﴾ ”(اے پیغمبر) کہو کہ: یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوا ہے، لہٰذا اسی پر تو انھیں خوش ہونا چاہیے“۔اس آیت مبارکہ میں دو چیزوں کو فرحت و مسرت کا سامان قرار دیا گیا ہے، ایک فضل دوسرے رحمت کو، ان دونوں سے یہاں کیا مراد ہے؟اس کے متعلق مفسرین کرام کے اقوال پیش خدمت ہیں:

مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں:فضل الله: الإيمان، ورحمته: القرآن.(تفسير البغوي،ج:۲،ص:۴۲۳) ”فضل اللہ سے مراد ایمان ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مراد قرآن ہے“۔حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فضل الله: القرآن ورحمته أن جعلنا من أهله. (تفسير البغوي،ج:۲،ص:۴۲۳) ”فضل اللہ سے مراد قرآن ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس قرآن کا اہل بنادیا، یعنی قرآن پر ایمان رکھنے والا بنادیا“۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: فضل الله: الإسلام، ورحمته: تزيينه في القلب. (تفسير البغوي، ج:۲،ص:۴۲۳) ”اللہ تعالیٰ کے فضل سے مراد اسلام ہے جبکہ اس کی رحمت سے مراد اسلام کو دل میں مزیّن اور خوش کن بنانا ہے۔ خالد بن معدان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فضل الله: الإسلام، ورحمته: السنن. (تفسير البغوي، ج:۲،ص:۴۲۳) ”اللہ کے فضل سے مراد اسلام جبکہ اس کی رحمت سے مراد سنن ہیں“۔ بعض لوگوں کا یہ قول بھی ہے: فضل الله: الإيمان، ورحمته: الجنة. (تفسير البغوي،ج:۲،ص:۴۲۳) ”اللہ کے فضل سے مراد ایمان جبکہ اس کی رحمت سے مراد جنت ہے“۔

﴿فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا﴾ أي: ليفرح المؤمنون أن جعلهم الله من أهله، ﴿هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾ أي: مما يجمعه الكفار من الأموال، (تفسير البغوي،ج:۲،ص:۴۲۳) ”اسی پر تو انھیں خوش ہونا چاہیے، یعنی مؤمنین کو خوش ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کو اسلام اور قرآن جیسی عظیم نعمت کا اہل بنادیا ہے۔ یہ اس تمام دولت سے کہیں بہتر ہے جسے یہ جمع کر کر کے رکھتے ہیں، یعنی کفار جو اموال جمع کر کے رکھتے ہیں، ان کے مقابلے میں اسلام اور قرآن کی نعمت کہیں بہتر و برتر ہے۔

تفسیر سعدی میں اس کی تفسیر یوں فرمائی گئی ہے: ﴿فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾ من متاع الدنيا ولذاتها. (تيسير الكريم الرحمن في تفسير كلام المنان،ص:۳۶۶) ”اسی (اسلام اور قرآن) پر تو انھیں خوش ہونا چاہیے، یہ اس تمام دولت سے کہیں بہتر ہے جسے یہ جمع کر کر کے رکھتے ہیں، یعنی دنیا کے ساز و سامان اور لذات سے“۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس آیت کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ کا ایک قول نقل کرتے ہیں: «مَنْ هَدَاهُ اللّٰهُ عَزَّ

وَجَلَّ لِلْإِسْلَامِ وَعَلَّمَهُ الْقُرْآنَ، ثُمَّ شَكَا الْفَاقَةَ كَتَبَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ الْفَقْرَ بَيْنَ عَيْنَيْهِ إِلَى يَوْمِ يَلْقَاهُ،ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ ﷺ هَذِهِ الْآيَةَ: ﴿قُل بِفَضلِ اللّٰهِ وَ بِرَحمَتِهِ فَبِذٰلِکَ فَلیَفرَحُوا، هُوَ خَیرٌ مِّمَّا یَجمَعُونَ﴾ مِنْ عَرَضِ الدُّنْيَا مِنَ الْأَمْوَالِ»(أمالي ابن بشران،حديث:۴۹۳،الناشر: دار الوطن الرياض، الطبعة الأولى:۱۴۱۸ھ)

”جس شخص کی اللہ تعالیٰ نے اسلام کی طرف رہنمائی کی ہو اور اسے قرآن سکھایا ہو، پھر بھی وہ فاقے کی شکایت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے حق میں روز قیامت تک کے لیے فقر و محتاجی لکھ لیتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿قُل بِفَضلِ اللّٰهِ وَ بِرَحمَتِهِ فَبِذٰلِکَ فَلیَفرَحُوا، هُوَ خَیرٌ مِّمَّا یَجمَعُونَ﴾ ” (اے پیغمبر) کہو کہ: یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوا ہے، لہٰذا اسی پر تو انھیں خوش ہونا چاہیے، یہ اس تمام دولت سے کہیں بہتر ہے جسے یہ جمع کر کر کے رکھتے ہیں۔ یعنی دنیا کے مال و اسباب سے“۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت یعنی قرآن، اسلام اور ایمان اللہ تعالیٰ کے بندوں پر اللہ کا ایک عظیم انعام و احسان ہے، انھیں اس پر خوش ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ خوش ہونے کی چیز ہے اور یہ دنیا کے ساز و سامان اور منصب و عزت سے کہیں بہتر ہے کیونکہ اسلام اور قرآن جیسی نعمت جسے بقائے دوام حاصل ہے اس کے مقابلے میں دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں فانی اور چند روزہ ہیں۔ لہٰذا اصل خوش ہونے کی چیز اسلام اور قرآن ہے نہ کہ عارضی دنیا کی لذتیں اور نعمتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام اور قرآن جیسی عظیم نعمت پر شکر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

*****

ابنِ عباس
معاون قلم کار

حدیثِ مزارعت

جہاں تحریکِ آزادی کے مجاہدین کی جاسوسی اور مسلمانوں سے غداری کے انعام کے طور پر فرنگی آقاؤں سے ملنے والی قابل ضبطی جاگیروں کی چاکری کرنے والے بہت ہیں وہیں شرعی کراء الارض اور غیر حاضر زمین داری کو مجمع علیہ حرامِ مطلق قرار دینے والے بھی کافی سارے ہیں۔ ان معترضین کا شکوہ یہ بھی ہے کہ ملوکیت نے آکر جاگیرداری کو جائز قرار دے دیا۔ حالانکہ روایات اس کے برعکس ہیں، ذیل میں وہ روایات پیش کی جارہی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ دور خلافت راشدہ میں توجاگیرداری آب و تاب کے ساتھ جاری رہی، ملاحظہ کیجیے:

عَنْ نَافِعٍ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يُكْرِي مَزَارِعَهُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِﷺوَفِي إِمَارَةِ أَبِي بَكْرٍ،وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَصَدْرًا مِنْ خِلَافَةِ مُعَاوِيَةَ حَتَّى بَلَغَهُ فِي آخِرِ خِلَافَةِ مُعَاوِيَةَ أَنَّ رَافِعَ بْنَ خَدِيجٍ يُحَدِّثُ فِيهَا بِنَهْيٍ عَنِ النَّبِيِّﷺفَدَخَلَ عَلَيْهِ وَأَنَا مَعَهُ فَسَأَلَهُ فَقَالَ:«كَانَ رَسُولُ اللهِﷺيَنْهَى عَنْ كِرَاءِ الْمَزَارِعِ»فتَرَكَهَا ابْنُ عُمَرَ بَعْدُ وَكَانَ إِذَا سُئِلَ عَنْهَا بَعْدُ قَالَ:زَعَمَ رَافِعُ بْنُ خَدِيجٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِﷺنَهَى عَنْهَا(صحيح مسلم)

”حضرت نافع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی زرعی زمین کرائے پر دیا کرتے تھے۔ یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں جاری رہا، پھر دورِ صدیق رضی اللہ عنہ، دورِ فاروق رضی اللہ عنہ اور دورِ عثمان رضی اللہ عنہ میں بھی جاری رہا یہاں تک کہ دورِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حصے تک بھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

کے دور کے آخر میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ بات پہنچی کہ رافع بن خَدِیج رضی اللہ عنہ اس بابت رسول اللہ ﷺ سے ممانعت بیان کرتے ہیں تو ابنِ عمر رضی اللہ عنہما ان کے پاس یہ بات پوچھنے گئے جب کہ میں ان کے ساتھ تھا۔ حضرت رافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے زرعی زمین کا کرائے پر لینا منع فرمایا ہے تو اس پر ابنِ عمر نے یہ معاملہ چھوڑ دیا اور اس کے بعد جب ان سے پوچھا جاتا تو وہ فرماتے کہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے"۔

غیر حاضر زمین داری کے ناقدین کا مقدمہ یہ ہے کہ رسالت مآب ﷺ کی طرف سے مزارعت کی حرمت آخری دور میں بیان کی گئی جس کی وجہ سے صحابہ کرام اس سے ناواقف رہے اور وہ ناواقفیت کی بنا پر مزارعت میں ملوث رہے لیکن جب انھیں علم ہوا تو انھوں نے مزارعت ترک کردی۔ بطور مثال وہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ترکِ مزارعت نقل کرتے ہیں۔ لیکن حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے موقف کی وضاحت ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے جس کے مطابق جب آپ کو رافع بن خدیج کے حدیث بیان کرنے کا علم ہوا تو آپ رافع سے ملے اور پوچھا: اے رافع! آپ رسول اللہ ﷺ سے زمین کے کرائے کے بارے میں کیا بیان کرتے ہیں۔ رافع نے کہا: میرے دو چچا اصحابِ بدر میں سے تھے۔ میں نے سنا وہ اپنے گھر والوں سے بیان کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین کے کرائے سے منع کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر نے کہا: وَاللهِ لَقَدْ كُنْتُ أَعْلَمُ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَنَّ الْأَرْضَ تُكْرَى خدا کی قسم میں دورِ نبی ﷺ کے بارے میں خوب جانتا ہوں کہ زمین کرائے پر دی جاتی تھی۔ حضرت سالم بیان کرتے ہیں: "پھر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خدشہ لاحق ہوا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے اس بابت کوئی بات ارشاد فرمائی ہو جو میرے علم میں نہ آسکی ہو تو اس احتیاط کی بنیاد پر انھوں نے زمین کرائے پر دینا چھوڑ دیا"۔ (صحیح مسلم) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا مزارعت ترک کرنا، احتیاط پر مبنی تھا جو آپ رضی اللہ عنہ کا مخصوص مزاج تھا۔ اس معاملے میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا فہم بھی قابلِ غور ہے آپ کے خیال میں نبی کریم ﷺ کا زرعی زمین کے کرائے سے روکنا، قانونی

اندازکی چیزنہیں تھی بلکہ آپ ﷺ ایک اخلاقی تعلیم بتارہے تھے کہ کرائے پر زمین دے کرمادی فوائدسمیٹنے سے بہتر ہے کہ احسان کرتے ہوئے زمین اپنے مسلمان بھائی کو دے دو تاکہ اخروی اجر وثواب کے مستحق بن سکو۔ درج ذیل روایت اس بات کوبیان کرتی ہے:عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ يَقُولُ كُنَّا نُخَابِرُ وَلَا نَرَى بِذَلِكَ بَأْسًا حَتَّى زَعَمَ رَافِعُ بْنُ خَدِيجٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْهُ- قَالَ عَمْرٌو: ذَكَرْتُهُ لِطَاوُسٍ فَقَالَ طَاوُسٌ: قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: إِنَّمَا قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ:يَمْنَحُ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ الْأَرْضَ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَأْخُذَ لَهَا خَرَاجًا مَعْلُومًا(مسنداحمد)

”حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم بٹائی پر زمین دے دیا کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے،بعد میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے،راوی کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات طاؤس سے ذکر کی تو انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نبی ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا کہ تم میں سے کسی شخص کا اپنی زمین اپنے بھائی کو بطورِ ہدیہ پیش کر دینا اس سے بہتر ہے کہ وہ اس سے اس پر کوئی معین کرایہ وصول کرے“۔ درج ذیل روایت میں یہ بات صراحت سے نقل ہوئی ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک رسول اللہ کی ممانعت مزارعت مبنی بر حرمت نہیں تھی:عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنه «أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَمْ يُحَرِّمِ الْمُزَارَعَةَ، وَلَكِنْ أَمَرَ أَنْ يَرْفُقَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ»(سنن ترمذی)”حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزارعت کو حرام نہیں کیا تھا بلکہ آپ نے یہ حکم دیا تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کریں(اور اپنی زمین دوسرے کو کاشت کے لیے مفت دے دیا کریں)“۔

*****

مولانا نایاب حسن قاسمی

رکن شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف: تجزیہ و تعارف (۱)

انیسویں صدی کے نصفِ آخر اور بیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان کے سیاسی، علمی، تہذیبی و فکری منظرنامے پر جن قدآور شخصیات نے اپنے فکر و نظر، جہدِ مسلسل اور اخلاق و کردار کے تابناک نقوش مرتسم کیے اور ہم عصر ہندوستان سے اپنی گوناگوں خوبیوں، امتیازات اور خصوصیات کا لوہا منوایا، ان میں ایک انتہائی باعظمت نام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا بھی ہے، جنھیں ان کے قدردانوں نے بجا طور پر "شیخ الاسلام" اور "شیخ العرب والعجم" جیسے وقیع القاب سے نوازا، کہ اسلامی علوم میں ان کی گہرائی و گیرائی، بہ طورِ خاص علومِ حدیث میں ان کی متخصصانہ شان اور اس حوالے سے عرب و عجم کے وسیع تر دائرے میں ان کی خدمت و شہرت، ملکی و عالمی سیاست و تاریخ کے مد و جزر سے ان کی بصیرت مندانہ واقفیت، اسرار و رموزِ دینی کے معاملے میں ان کی تہ رسی و دروں بینی، ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں ان کی بے پناہ قربانیاں اور اس راہ میں ان کی ضرب المثل جاں فروشی، بے خوفی اور جُرأت و بے باکی، کسرِ نفسی، خلوصِ کامل اور ایثار جیسے نبوی صفات میں ان کی یکتائی و انفرادیت اسی کی متقاضی تھیں۔

بلاشبہہ حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ نہ صرف اپنی اُس عظیم الشان درس گاہ کے علمی فیضانات کے حسین پرتو تھے، جو اپنے قیام سے لے کر آج تک عالمِ اسلام میں دینی علوم کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر ممتاز شناخت رکھتی ہے؛ بلکہ وہ اس تحریکِ جہد و جہاد کے بھی جاں سپار رکن تھے، جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کی اولاد و احفاد سے شروع ہوئی اور سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

رحمہ اللہ، فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ اور بلند فکر مردم ساز، عبقری شان کے مالک شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ کے راستے ان تک پہنچی تھی، وہ اپنے وقت میں عظیم الشان عالمِ دین اور محرمِ اسرارِ نبوت بھی تھے، بے باک اور سربہ کف مجاہد بھی، تصوف وسلوک کے امام بھی اور اخلاق واقدارِ اسلامی کے عظیم ترین قدردان اور ان کا پیکرِ محسوس بھی۔

ان کی زندگی کا بیشتر حصہ یا تو ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی سرگرمیوں میں گزرا یا دارالعلوم دیوبند کی مسندِ تدریس سے تشنگانِ علومِ نبوت کو سیراب کرنے میں یا پھر اپنے منتسبین ومعتقدین کی روحانی واخلاقی تربیت میں؛ یہی وجہ ہے کہ بے پناہ صلاحیتوں کے باوصف ان کی تصنیفی خدمات بہت کم ہیں، ان کے قلم کو خاطر خواہ جولانیوں کا موقع ہی کب میسر آیا؟ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے قلم سے جو بھی تحریریں معرضِ وجود میں آئیں، وہ نہ صرف علمی وتاریخی نکتہ طرازیوں کا اعلیٰ نمونہ ہیں؛ بلکہ وہ ادبی ولسانی خوبیوں کے حسین شہ پارے بھی ہیں۔

مولانا کے رشحاتِ قلم میں خود نوشت سوانح "نقشِ حیات" کے علاوہ "اسیرِ مالٹا"، "متحدہ قومیت اوراسلام"، "مکتوباتِ شیخ الاسلام"، "مودودی دستور وعقائد کی حقیقت"، "ایمان وعمل" اور "سلاسلِ طیبہ" ہیں؛ جب کہ جمعیت علماے ہند کے مختلف اجلاس میں پیش کیے گئے صدارتی خطبات کا مجموعہ "خطباتِ صدارت" نہایت اہم ہیں۔

(ا) نقشِ حیات

یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۵۳ء/۱۳۷۲ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی، پھر اسے یکجا کر دیا گیا اور اب یہ ایک ہی جلد میں دستیاب ہے، اس وقت سے لے کر اب تک اس کے بے شمار ایڈیشن ہندوپاک کے مختلف مکتبوں سے چھپ چکے ہیں، یہ کتاب اپنے آپ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، یہ صرف مولانا کی سوانح ہی نہیں؛ بلکہ اس وقت کی عالمی سیاست میں برپا ہونے والے ہیجانات کا علمی، منطقی وتاریخی تجزیہ بھی ہے، اس کو لکھنے کی وجہ آپ کے شاگردوں اور نیازمندوں کا غیر معمولی اصرار ہے، جو چاہتے تھے کہ خود آپ کے قلم سے آپ کے حالاتِ زندگی مرتب ہوکر آجائیں؛ تاکہ بعد والوں تک آپ کی زندگی کا صحیح ترین نقشہ پہنچ جائے اور وہ ان حالات سے بھی بہ خوبی واقف ہوجائیں، جن سے آپ، آپ کے استاذِ

گرامی (حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ) اور بیسویں صدی کے مسلمان گزرے اور ان کے سامنے ان قربانیوں کی سچی جھلکیاں بھی آجائیں، جو اسلامیانِ ہند نے آزادیِ وطن کی خاطر پیش کیں اور کسی بھی قسم کی بزدلی، کم ہمتی کو آڑے نہ آنے دیا، مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ اس کتاب کے "تعارف اور وجہِ تالیف" کے تحت لکھتے ہیں: "۱۹۴۲ء میں جب آپ نینی تال جیل میں قید وبند کی زندگی بسر کر رہے تھے، تو بعض خدام اور بے تکلف احباب نے آپ سے سوانحِ حیات قلم بند کرنے کی درخواست کی؛ تاکہ اس طرح اکابرِ امتِ مرحومہ کے اس اسوہ کا بھی اتباعِ کامل ہوجائے، جس کو امامِ اعظم ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل اور دوسرے مقدس اساطین رحمہم اللہ نے اپنے اخلاف کے لیے یادگار چھوڑا ہے، اوّل اوّل آپ نے انکار کیا؛ لیکن جب عرض وگزارش نے اصرارِ پیہم کی شکل اختیار کرلی، تب مجبور ہوکر قلم اٹھایا اور اپنی زندگی سے متعلق چند صفحات لکھ دیے؛ مگر جنبشِ قلم جب اس موڑ پر پہنچی، جہاں سے وہ اپنے مقدس استاذ شیخ الطریقت حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ العزیز کا رفیق بن کر میدانِ سیاست میں گام زن ہوئے تھے، تو اس کے سامنے سب سے اہم اور وقیع مسئلہ یہ پیش آیا کہ آخر شیخ الہند رحمہ اللہ اور ان کے رفقاے کار نے یورپین اقوام خصوصاً انگریزی اقتدار کی مخالفت میں سیاست کی پُرشور اور ہنگامہ آرا زندگی کیوں اختیار کی؟... چناں چہ حضرت مصنف کے سامنے یہ سوال سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ آیا، یہ پوری جلد، جو آپ کے سامنے ہے، اس کا بیش تر حصہ اسی سوال کا مدلل جواب ہے، دوسری جلد میں قطب العالم، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ کی سیاسی تحریک کے وہ گوشے، جو اب تک پردۂ خفا میں تھے اور رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ بھی جن کو بے نقاب نہیں کرسکی تھی، ان کی نقاب کشائی کی گئی ہے"۔(۱) اور خود صاحبِ سوانح رقم طراز ہیں: "عرصۂ دراز سے احباب مجھ سے میری سوانح عمری کی مختلف باتیں دریافت فرماتے رہتے تھے، حسبِ موقع جواب دیتا رہتا تھا، بعض احباب نے مختلف اخباروں اور رسائل میں ان کو شائع بھی کردیا؛ مگر افراط وتفریط اور زیادتی وکمی سے وہ مضامین خالی نہیں رہے اور بعض چیزیں غلط بھی شائع ہوئیں، جن کے تذکرے پر اصرار کیا گیا کہ صحیح واقعات قلم بند کردیے جائیں؛ بالآخر ۱۹۴۲ء میں نظر بندی کی نوبت آئی اور جب کہ میں نینی تال جیل، الہ آباد میں تھا، تو اس کی پرزور تحریک ہوئی اور کہا گیا کہ اس وقت تو تجھ کو بہت سی مصروفیات سے نجات حاصل ہے، اس کو غنیمت جان کر اس مہم کو پورا کردینا چاہیے؛

کیوں کہ اس میں علاوہ تاریخی واقعات کے تذکرے کے آنے والے لوگوں کے لیے ہدایت اور مشعلیتِ راہ بھی ہے اور نعمائے الٰہیہ کی تحدیث کی عمدہ صورت بھی"۔(۲)

کتاب کے شروع میں آپ نے اپنے خاندان کے حالات بیان کیے ہیں، جن میں آپ کے خاندان اور سلسلۂ نسب کا بھی مفصل اور سیر حاصل تذکرہ ہے، پھر اپنی ابتدائی تعلیم کے واقعات، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں حصولِ تعلیم کی تفصیلات اور اساتذہ کا ذکرِ خیر ہے، اس ذیل میں آپ نے ان تمام شخصیات کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے کسی نہ کسی عنوان سے آپ کو متاثر کیا۔

مولانا نے اس کتاب میں اپنے فن کی خاص رعایت کی ہے، اپنے تعلق سے لکھتے وقت ان نکات واحوال کو خصوصی طور پر مدنظر رکھا ہے، جو قاری کی نگاہ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، سوانح نگاری اور بالخصوص خود نوشت سوانح نگاری ادب کی انتہائی نازک صنف مانی جاتی ہے، خود نوشت سوانح نگار کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ماڈل بنا کر پیش نہ کرے، کہ اس کی تحریر خود ستائی و خود نمائی کا مرقع بن کر رہ جائے؛ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھ بیتے ہوئے حادثات و واقعات کو بغیر کسی تحفظ کے جوں کا توں بیان کرے؛ تاکہ اس کی شخصیت کا واقعی سراپا قاری کے سامنے کھل کر سامنے آجائے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے، تو نہ صرف یہ کہ اس فن کی روح کے مجروح ہونے کا خطرہ ہے؛ بلکہ اس قسم کی سوانحِ حیات کسی اعتنا کے قابل نہیں سمجھی جاتی، مولانا کو اس حقیقت کا کامل ادراک تھا؛ اس لیے آپ کے قلم کی روش پوری طرح فن کی مقتضیات کو پورا کرتی ہے، آپ کہیں بھی یہ ایہام نہ ہونے دیتے کہ سوانح نگار اپنے وقت کا ایک زبردست عالم، محدث، مرشد اور مجاہد ہے؛ بلکہ آپ اپنے کو ایک عام آدمی کی طرح پیش کرتے ہیں، جس کی زندگی کا آغاز ایسے ہی ہوا، جیسے کہ دیگر لوگوں کی زندگی کی شروعات ہوتی ہے، اس کا اندازہ آپ کے بچپن کے اس واقعے سے بہ خوبی ہوتا ہے، لکھتے ہیں: ”مجھ کو ہوش و حواس جب آئے، تو میں نے اپنے آپ کو ٹانڈہ میں پایا، بانگرمئو (جہاں آپ کی پیدایش ہوئی تھی) بالکل یاد نہیں، والدین مرحومین کو اولاد کی تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اور بہت زیادہ خیال تھا اور اس کے لیے والد مرحوم بہت زیادہ سختی کرتے تھے؛ اس لیے مجھ کو کھیلنے کا موقع آزادی کے ساتھ صرف چار برس کی عمر تک ملا ہے، جب اس عمر کو پہنچا، تو گھر میں

والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی، اس کے بعد سپارہ پڑھنا پڑتا تھا،صبح ساڑھے نو بجے تک تو یہ قید اور پڑھائی گھر میں ہوتی تھی اور ساڑھے نو بجے کھانا کھاکر والد مرحوم کے ساتھ اسکول جانا پڑتا تھا، اسکول اللہ داد پور سے تقریبًا ایک میل یا اس سے کچھ زائد دوری پر ہے، اسکول کی تعلیم میں بھی مدرسین اس زمانے میں خوب مار پیٹ کرتے تھے"۔(۳)

اس اقتباس سے حضرت کے گھر کے علمی ماحول اور والدین کی اولاد کی بہترین علمی واخلاقی تربیت سے غیر معمولی دل چسپی کا احساس ہوتا ہے، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ماحول اور وراثت دونوں اثرانداز ہوتے ہیں؛ اس لیے اپنی سوانح اس انداز سے پیش کی کہ قاری کو معلوم ہوجائے کہ سوانح نگار کس حد تک وراثت کا مِنَّت کَش ہے اور اس کی نشوونما میں کس حد تک ماحول اور گردوپیش کی کارفرمائی ہے، یہ ذہن میں رہے کہ ماحول اور وراثت دونوں ایک حد تک ہم آہنگ بھی ہیں اور بہت حد تک ان میں ایک دوسرے سے بے گانگی بھی ہے، سوانح نگاروں کا ایک حلقہ وراثت کی زیادتی تاثیر پر زور دیتا ہے، جب کہ دوسرا حلقہ ماحول کو شخصیت کی تعمیر میں زیادہ اثرانداز مانتا ہے، اگرچہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ وراثت اور ماحول دونوں تعمیر وتشکیلِ شخصیت کے جوہری عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں؛ لیکن ان دونوں کے ساتھ خود شخصیت کے اندر بھی ایک خاص عنصر ہوتا ہے، جو خالص مذاقی یا انفرادی نوعیت کا اور جس کے بغیر کسی بھی ذات کی تعمیر نقطۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی، یہی وہ مقام ہے جس سے اگر صاحبِ سوانح صحیح طور سے عہدہ برآ نہ ہوسکے، تو وہ اپنے راستے سے بھٹک جاتا ہے اور پھر اس کا قلم مختلف وادیوں میں قلابازیاں کھاتا اور اس کی تحریریں افراط وتفریط کی تنگنائیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہیں، مولانا نے اس مقام پر بھی فنی نزاکتوں کو مکمل طور پر محسوس کیا اور کہیں بھی اس فن کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے اور اپنے مخصوص اندازِ بیان میں اس منزل کو اس خوبی سے سر کیا ہے کہ یہ تحریریں پڑھنے والے کی دلچسپیوں کا باعث بن گئی ہیں۔

شروع میں یہ عرض کیا گیا کہ "نقشِ حیات" صرف مولانا کے احوالِ زندگی کی دستاویز ہی نہیں؛ بلکہ یہ اس دور کی سیاسیات ومعاشرت کی مشاہداتی، تجرباتی ومطالعاتی تاریخ بھی ہے؛ اس لیے جب ہم اس کتاب کے اس حصے کا مطالعہ کرتے ہیں، جس میں انھوں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے، تو ہمارے سامنے اس وقت کے

سیاسی اتار چڑھاؤ کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے اور ان پر آپ کی گہری نظر کا بھی مکمل احساس ہوتا ہے۔ سوانح نگار اگر چاہے، تو کسی معمولی سے واقعے کو پھیلا کر اسے ایک مکمل کتابی شکل میں پیش کر سکتا ہے؛ لیکن یہ وصف کوئی پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا، ضرورت سے زیادہ تحریر کے پھیلاؤ سے پڑھنے والا اُکتا جاتا ہے اور پھر اس کے لیے اس کتاب کو از ابتدا تا انتہا پڑھ ڈالنا بہت ہی دشوار ہوتا ہے اور اگر اسے ختم کر بھی لیا جائے، تو قاری کے پلے کچھ بھی نہیں پڑتا اور اس کا دماغ جوں کا توں خالی رہ جاتا ہے؛ لیکن "نقشِ حیات" میں یہ نقص کہیں بھی نہیں پایا جاتا، اس کے مطالعے سے قاری کے احساس وشعور میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ صاحبِ سوانح نے بڑے بڑے اور اپنے پہلو میں تاریخ کی تہ بہ تہ پرتیں رکھنے والے واقعات کو بھی انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں بھی کتاب کے مرکزی خیال سے انحراف کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، کتاب کے بعض حصوں میں ایسے تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں، جو اپنے دامن میں درازنفسی لیے ہوئے ہیں؛ مگر ان کو اس خوش سلیقگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ طوالت بھی ان کے قلم کی ایک خوبی اور بیان پر ان کی مہارت کی واضح دلیل بن گئی ہے۔ "نقشِ حیات" میں کہیں بھی کسی قسم کی پیچیدگی، اٹکاؤ اور الجھاؤ نہیں ہے، مولانا اپنی عملی زندگی میں خواہ شخصی ہو یا معاشرتی، جس طرح اجلے کیریکٹر اور شفاف وواضح کردار کے انسان تھے، ان کی زندگی کا ہر گوشہ ہر زاویے سے کھلی کتاب کی مانند تھا، جسے ہر شخص بہ آسانی محسوس کر سکتا تھا، اسی طرح ان کی تحریریں بھی اپنے مظاہر اور معنویت کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں، انھوں نے جس مسئلے پر بھی قلم اٹھایا ہے، پوری باریک بینی، ژرف نگاہی کے ساتھ اٹھایا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ ان کے عمل وکردار کی طرح ان کی نگارشات میں بھی بھرپور سادگی اور وضاحت ہے، محشر اعظمی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے: "نقشِ حیات میں کسی جگہ الجھاؤ نہیں ملتا، مولانا نے عملی زندگی میں جس طرح ایک واضح، صاف اور متعیّن راہ اختیار کی تھی، ان کی تحریروں میں بھی وہی بات ملتی ہے، شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ اور ایک ہی شان نظر آتی ہے اور کہیں بھی کوئی ایسا موڑ نہیں ملتا، جہاں قلم نے اپنے حدود سے تجاوز کیا ہو اور ادائیگیِ مطلب کے لیے جن الفاظ کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، وہی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، مولانا جو کچھ لکھنا چاہتے تھے اور جس مقصد کے لیے انھوں نے قلم کو جنبش دی، قاری اسے بہ خوبی سمجھ لیتا ہے، نہ کہیں کوئی گوشہ تشنہ تکمیل ہے، نہ کہیں شک کی کوئی گنجایش موجود ہے"۔(۴)

''نقشِ حیات'' مولانا کی ایسی تصنیف ہے، جس میں ان کا اسلوبِ نگارش ایک خاص انداز میں جلوہ گر ہے، جو بہت ہی سنجیدہ اور جامع ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایک طرح کی پاکیزگی کا حساس ہوتا ہے، ذاتی تفصیلات و جزئیات عام طور پر ایسی ہوتی ہیں، جن سے بعض اوقات قاری اکتاہٹ کا شکار ہوجاتا ہے؛ اس لیے اپنی باتوں کو پیش کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، اگر بات اختصار طلب ہے، تو اس کو طول دینے سے گریز کرنا چاہیے اور اگر وہ تفصیل چاہتی ہے تو اسے پھیلا کر لکھنا چاہیے، مولانا کے زورِ قلم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ خالص ذاتی معاملات کی جزئیات میں قاری کو زیادہ دیر نہیں الجھاتے؛ بلکہ ''نقشِ حیات'' میں پیش کیا گیا ان کی زندگی کا ایک ایک واقعہ کسی نہ کسی خاص پسِ منظر کا حوالہ ہے، مثلاً جہاں پر انھوں نے اپنی زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، وہ حصہ ان کی زندگی کے آئینے میں ہندوستان بھر کی سیاسی واجتماعی حالات کی عکاسی کرنے والا ہے، انھیں اس بات پر کمال حاصل ہے کہ وہ اپنے مطلب کو اس واضح انداز میں سمجھا دیتے ہیں کہ قاری کے ذہن و دماغ میں یقین کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور اس کے احساس و وجدان میں تحریک کی شمع روشن ہونے لگتی ہے۔

''نقشِ حیات'' کا ایک اور اہم گوشہ یہ ہے کہ مولانا نے اس میں پیش کیے گئے ہر واقعے کو دلائل، شواہد اور مستند اعداد و شمار سے مبرہن کیا ہے؛ چناں چہ جہاں آپ نے انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کے ہاتھوں ہندوستان کی تجارت و معیشت و معاشرت کی تاراجی کو بیان کیا ہے، تو اسے مدلل کرنے کے لیے خود انگریز مؤرخین کی تصانیف سے حوالے پیش کیے ہیں، اس حصے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس قلب و دماغ پر چھاجاتا ہے کہ صاحبِ کتاب کو تاریخ اور اس کے مآخذ سے حیرت ناک حد تک آگاہی ہے، مولانا جہاں مذہبی اور علمی معاملات میں جابہ جا قرآنی آیات اور حدیثی استدلالات کا مضبوط سہارا پکڑتے ہیں اور ان کے ارشادات کی روشنی میں اپنے موقف اور نظریے کی قوت و وقعت پر برہان قائم کرتے ہیں، وہیں تاریخی واقعات کے تذکرے اور تجزیے کے وقت اس فن کی امہاتِ کتب کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کسی بھی اعتبار سے شک و شبہے میں مبتلا نہ ہو؛ بلکہ اس کا ذہن یقین کی سرور بخشیوں سے سرشار ہوجائے، بہ قول محشر اعظمی: ''نقشِ حیات میں زیادہ تر انگریزی تصنیفات اور تحریروں کا حوالہ دیا گیا ہے، جن لوگوں نے ہندوستان پر ظلم کیا، اس کی دولت لوٹی اور پھر اپنے احسانات بھی جتائے اور ہر طرح اپنے عیب و جرم کو

چھپانے کی کوشش کی، مولانا نے خود انھی کی تحریروں سے انھیں بے نقاب کر دیا اور ان کی پوری قلعی کھول کر رکھ دی اور یہ ثابت کر دیا کہ انگریز ظالم تھے، انھوں نے ہندوستان کا خون چوسنے میں اپنی خوں خواری کا پورا ثبوت دیا"۔(۵)

خلاصہ یہ ہے کہ نقشِ حیات اپنے وقت کے ایک عظیم عالم و محدث، تحریک آزادی کے کفن بردوش مجاہد اور شب زندہ دار زاہد کی سیر حاصل داستانِ حیات بھی ہے، جو انتہائی سادگی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی بیسویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی نشیب و فراز کی سچی اور حقیقت نما تصویر بھی۔

(۲)اسیرِ مالٹا

یہ آپ کی اس وقت کی تصنیف ہے، جب آپ کا قلم جوان تھا، اس کے شروع کے صفحات میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے امتیازی اوصاف و شمائل کو بہت ہی دل آویز اسلوب، انتہائی پرکشش طرز اور ایسے شیریں و سحر انگیز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ قاری ان میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے، مثلاً شروع کے یہ چند جملے: "اس نے بحرِ امدادی سے فیوضات حاصل کیے؛ مگر ڈکار نہ لی، اس نے قاسمی نہریں پی ڈالیں؛ مگر ہضم کر گیا، اس نے رشیدی گھٹاؤں اور دھواں دھار بادلوں کو چوس لیا؛ مگر کبھی بے اختیار نہ ہوا، دعویٰ نہ کیا، شطحیات نہ سنائیں، استقامت سے نہ ہٹا، شریعت کو نہ چھوڑا، عشق میں گھل کر لکڑی ہو گیا؛ مگر دم نہ مارا. . . "۔(٦)

چند صفحات تک تو یہی سحر انگیز اسلوب ہے؛ مگر کتاب کے بقیہ حصے میں تحریر کا یہ رنگ نہیں ہے، اس کتاب میں مولانا نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی تحریکِ آزادی کے نقطۂ آغاز سے لے کر مکہ معظمہ کے سفر، وہاں تک پہنچنے اور پہنچنے کے بعد کی روداد، شریفِ مکہ کی آپ کے تئیں بدگمانی، مکے میں محبوسی، وہاں سے مصر (جیزہ) کو روانگی اور مصر کی ایک ماہ کی اِسارت کے بعد ۱۵/فروری ۱۹۱۷ء/۲۳/ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو مالٹا کی روانگی، سفر کے احوال، مالٹا کی مدتِ محبوسیت میں شب و روز کی سرگرمیوں، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے سلسلۂ تدریس و ترجمہ قرآنِ پاک کے معمولات، حضرت کے دیگر رفقا مولانا حکیم نصرت حسین، مولانا عزیر گل، مولانا وحید احمد اور حضرت مدنی رحمہم اللہ کے شبانہ روز کے اشتغالات، مولانا حکیم نصرت حسین رحمہ اللہ کے سانحۂ ارتحال کی روداد، پھر تین سال کی اسارت کے بعد رہائی اور وہاں سے دیوبند تک آمد

کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، تتمہ کے تحت کرنل اشرف بیگ، جو حکومت ترکی کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے اور ان کی اپنی ایک علیحدہ فوج تھی، جو خلافتِ عثمانیہ کے لیے کام کرتی تھی، صنعاے یمن کے امام یحییٰ نے گورنر انور پاشا کو خط لکھا تھا کہ تم اشرف بیگ کو اپنی فوج کے ساتھ بھیج دو، میں اپنی اور ان کی فوج کے ساتھ مل کر شریف حسین (جس نے خلافتِ عثمانیہ سے بغاوت کی اور پورے حجاز میں ترکی حکومت کے خلاف احتجاج کا طوفان برپا کرکے وہاں سے اس کا خاتمہ کروادیا) پر چڑھائی کروں؛ تاکہ اس سے اس کی اسلام دشمنی وانگریزوفاداری کا بدلہ لیا جائے؛ چناں چہ انور پاشا نے کرنل اشرف کو بھیج دیا؛ لیکن مدینے میں ہی انھیں اور ان کی فوج کو شریف حسین کے گرگوں نے دھرلیا، دونوں کے درمیان زبردست معرکہ آرائی ہوئی؛ بالآخر کرنل اشرف کی فوج پسپا ہوگئی اور انھیں گرفتار کرکے اسی جماعت کے ساتھ، جس میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور آپ کے رفقا تھے، مالٹا بھیج دیا گیا، مولانا مدنی رحمہ اللہ نے ان کا، ان کے خاندان کا اور مالٹا کے قیام کے دوران ان کے شریفانہ اخلاق ومعاملات اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے تئیں ان کے غیر معمولی جذبۂ احترام وتکریم کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، کتاب کے اخیر میں تقریباً سات صفحات میں حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا بھی اجمالی تذکرہ شامل ہے، تذکرہ نویس محمد مبین خطیب ہیں۔

جاری ہے

حواشی

(۱)ص:۵-۴، مطبوعہ: مکتبہ دینیہ، دیوبند۔
(۲)ص:۷۔
(۳)ص:۴۲۔
(۴)روزنامہ الجمعیۃ، "شیخ الاسلام نمبر" ص:۱۷۲۔
(۵)ایضاً، ص:۱۷۳۔
(۶)ص:۸، مطبوعہ: مکتبہ الفضل، دیوبند۔

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۸)

سلطنتِ روم اور مسلمانوں کی کشاکش

خلافتِ بنو امیہ

عالمِ عرب میں بنو امیہ کی خلافت کی شروعات ۴۱ ہجری سے ہوئی اور اس کا خاتمہ ۱۳۲ ہجری میں ہوا۔ بنو امیہ کی خلافت میں دو خاندان حکمران رہے۔ پہلے خاندان کو آلِ سفیان کہا جاتا ہے اور دوسرے خاندان کو آلِ مروان کہا جاتا ہے۔ آلِ سفیان کے پہلے خلیفہ مشہور صحابی حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا خلافت کے معاملے پر باہم اختلاف بھی رہا لیکن ۴۱ ہجری میں جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے ان کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عالمِ اسلام کے متفقہ خلیفہ بنے۔ آپ کی خلافت کا اختتام آپ کے انتقال کے موقے پر رجب ۶۰ ہجری (۶۷۹ عیسوی) میں ہوا۔ آپ کے دور میں جہاد اپنی آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ آپ کے بعد آپ ہی کی وصیت کے مطابق آپ کا بیٹا، یزید بن معاویہ خلیفہ بنا۔ کئی نامور صحابہ مثلاً عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی بیعت کر لی جبکہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کی بیعت نہیں کی۔ یزید کے اقتدار کے پہلے سال یعنی ۶۱ ہجری میں اس کی افواج کے ہاتھوں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا

افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ یزید کی حکومت کے آغاز ہی میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ آپ نے ۶۴ ہجری میں اپنی خلافت کا اعلان فرما دیا۔ مکہ اور مدینہ کے لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی۔ یزید کی طرف سے آپ پر چڑھائی کی گئی اور مکہ مکرمہ کا حصار کر لیا گیا لیکن دورانِ حصار ۶۴ھ میں یزید انتقال کر گیا۔ چنانچہ محاصرہ ختم اور مہم ناکام ہوئی۔ شام کے علاوہ کئی بڑے شہروں نے آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ یزید کے دور میں افریقہ میں کچھ فتوحات نصیب ہوئیں۔ البتہ روم کے ساتھ لڑائیوں کا موقع نہ آیا۔

عہدِ معاویہ بن یزید

یزید کے انتقال کے بعد اس کی وصیتِ ولی عہدی کے مطابق اس کے بیٹے حضرت معاویہ بن یزید رحمہ اللہ خلیفہ بنے۔ یہ زاہد و عابد اور عاقل و دانا شخص تھے لیکن اس وقت کسی بیماری کا شکار تھے۔ جس طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے خلافت ان کے حوالے کر دی تھی۔ اسی طرح کا خیال معاویہ بن یزید رحمہ اللہ کا بھی تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے ان کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر لیں تاکہ وہ عالم اسلام کے متفقہ خلیفہ بن جائیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے ایک دن لوگوں کو مسجد میں جمع کر کے خطاب کیا کہ مجھے خلافت کی ذمے داری سونپ دی گئی ہے حالانکہ میں اس سے عاجز ہوں اگر تم پسند کرو تو میں کسی لائقِ منصب کو خلیفہ بنا دوں لیکن میری نظر میں کوئی ایسا نہیں ہے یا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح چھے آدمیوں کی شوریٰ بنا دوں لیکن اس کا امکان بھی نظر نہیں آتا۔ زندگی نے وفا نہ کی اور بہ اختلافِ روایات ایک، دو یا تین ماہ کے اندر ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔

عہدِ مروان بن حکم

معاویہ بن یزید رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد حضرت عبد اللہ بن زبیر کے ساتھ صلح اور اتحادِ امت کے اس تصور کو صحابیِ رسول حضرت ضحاک بن قیس الفِہری رضی اللہ عنہ لے کر چلے۔ حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دیرینہ ساتھی اور دار الخلافہ دمشق پر آپ کے نائب رہے تھے۔ معاویہ بن یزید رحمہ اللہ کی بیماری کے دوران یہی

نماز پڑھایا کرتے تھے۔ آپ خاص اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ انھوں نے لوگوں سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نام کی بیعت لینا شروع کی۔ حمص کے گورنر حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نام کی بیعت لینی شروع کی۔ یہاں تک کہ مروان بن حکم نے بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی بیعت کرنے اور بنو امیہ کے لیے امان طلب کرنے کا ارادہ کیا لیکن بنو امیہ کے بعض لوگ اور ان کے دیرینہ حلیف عبید اللہ بن زیاد بوجہِ سانحہ کربلا کے اور حصین بن نمیر بوجہِ اپنے جرائم (حصارِ مکہ اور نصبِ منجنیق) وغیرہ اس خیال کے حامی نہ تھے اور وہ مختلف سازشوں سے اس منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ ان لوگوں نے ولید بن عقبہ بن ابی سفیان کو خلیفہ بنانا چاہا لیکن وہ ان کی باتوں میں نہ آئے۔ ان لوگوں کی سازشیں رنگ لائیں اور مروان بن حکم بھی ان کے ساتھ مل گئے جس کے صلے میں مروان کو خلیفہ بنا دیا گیا۔ اس طرح خلافت بنو امیہ، آلِ سفیان سے آلِ مروان کی طرف منتقل ہو گئی۔ مروان بن حکم ایک ہی سال کے اندر (یعنی ۶۵ھ) میں انتقال کر گئے۔

عہدِ عبدالملِک بن مَروان

مروان بن حَکَم کے بعد آپ کے بیٹے عبدالملِک بن مَروان خلیفہ بنے۔ ابتدائی سالوں تک ان کی خلافت شام و مصر تک محدود تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے عراق، مصر اور ماوراء النہر تک اپنی حکومت مستحکم کر لی۔ ۷۳ ہجری میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عبدالملک کی حکومت مکہ اور مدینہ پر بھی قائم ہو گئی۔ عبدالملک کے دور میں روم کی طرف سے شر انگیزی وقفے وقفے سے جاری رہی۔ ۷۰ ہجری میں جبکہ عبدالملک کی حکومت ابھی غیر مستحکم تھی اور داخلی طور پر انتشار جاری تھا۔ روم کی فوجوں نے شام کے شمالی حصوں کی طرف پیش قدمی کی۔ اس موقعے پر عبدالملک نے سلطنتِ روم کو صلح کی پیش کش کی اور اس شرط پر صلح کر لی کہ ہر جمعے کو ایک ہزار دینار سلطنتِ روم کو پیش کرتا رہے گا۔ (تاریخ محمود شاکر، جلد: ۴، ص: ۱۴۹) کچھ عرصے بعد ملکِ روم جستینان ثانی معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بعض عیسائی قبائل کو اسلامی حدود کی طرف چڑھا لایا۔ اب کے بار بھی خلیفہ عبدلملک بن مروان نے صلح کی کوشش کی اور سابقہ معاہدے کی تجدید کے ساتھ ایک ہزار دینار سالانہ کا اضافہ اس شرط پر کیا کہ عیسائی قبائل کو مسلمانوں پر حملے سے باز رکھا جائے

گا۔(الامویون والبیزنطیون،۱۷۵)لیکن رومی بادشاہ کے ساتھ یہ صلح بھی عارضی ثابت ہوئی اور کرنسی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ وہ یوں کہ بازنطینی دینار کے کچھ ٹکسال مصر میں قائم تھے۔ مسلمانوں کے مصر فتح کرنے کے بعد بھی ان ٹکسالوں میں دینار کے سکے بنائے جاتے رہے جو مصر، روم اور دیگر اسلامی علاقوں میں بھی لین دین کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ان دیناروں پر عیسی علیہ السلام کا اسم گرامی اور کلمہ ثلیث لکھا ہوتا تھا۔ خلیفہ نے کلمہ ثلیث کی جگہ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ لکھنے کا حکم دیا۔ قیصرِ جستینان نے اس عمل کو توہینِ عیسی علیہ السلام پر محمول کرتے ہوئے مسلمانوں کو سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ خلیفہ عبد الملک نے خالد بن یزید بن معاویہ کی رائے کے مطابق مسلمانوں کے لیے نئے سکے ڈھالنے کا فیصلہ کیا جن پر مقدس کلمات لکھے اور یہ سکہ دینارِ دمشقی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس وقت تک مسلمان حکومت، سلطنتِ روم کو صلح کا تاوان ادا کرتی تھی۔ اب جب کہ شاہِ روم کو زرِ تاوان، نئے دینارِ دمشقی میں موصول ہوا تو اس نے یہ رقم قبول کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ بھی کر دیا۔(الامویون و البیزنطیون ۱۷۹)رومی اس سے پہلے افریقہ میں مسلمانوں کو کافی زَک پہنچا چکے تھے۔ تین اہم مسلمان کماندار عقبہ بن نافع، ابو مہاجر دینار اور زہیر بن قیس رومیوں کے ہاتھوں شہید ہو چکے تھے۔ اب جب رومی بادشاہ نے سخت رویہ اختیار کیا تو عبد الملک بن مروان نے مجبوری اور مفاہمت والی پالیسی کے برعکس انھیں سبق سکھانے کا ارادہ کیا۔ ۷۳ ہجری میں رومیوں نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ آرمینیا کی طرف سے حملہ کیا۔ محمد بن مروان نے آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کیا اور انھیں شکستِ فاش سے دوچار کیا۔ آرمینیا میں ایک دوسرے مقابلے کے دوران عثمان بن ولید نے چار ہزار کے لشکر کے ساتھ، ساٹھ ہزار پر مشتمل رومی فوج کو شکست دی۔ ۷۵ ہجری میں رومی مرعش کی جانب سے بلادِ شام پر حملہ آور ہوئے۔ یہاں محمد بن مروان نے انھیں شکست سے دوچار کر کے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ ۸۱ ہجری میں خلیفہ عبد الملک نے اپنے بیٹے عبد اللہ بن عبد الملک کو بلادِ روم پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا جنھوں نے قالیقالا کا رومی علاقہ فتح کر لیا۔ ۸۴ ہجری میں عبد الملک خود فوج کی قیادت کرتے ہوئے انطاکیہ سے گزرتے ہوئے مِصّیصہ پر حملہ آور ہوئے اور اسے فتح کرتے ہوئے رومیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ اسی سال جزیرہ صقلیہ (سسلی) پر عطاء بن رافع کو سمندری راستے سے حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ ۸۶ ہجری میں عبد الملک نے اپنے بیٹے مسلمہ بن عبد الملک کو روم پر

حملہ کرنے کا حکم دیا جنھوں نے بولق اور اخرم کے قلعے فتح کیے۔ بہت سارا مال غنیمت حاصل ہوا اور کئی ایک رومیوں کو قیدی بھی بنایا گیا۔ اس دوران افریقی علاقوں میں روم اور مسلمانوں کی چپقلش جاری رہی۔ عبد المَلِک بن مَروان کا انتقال ۸۶ ہجری میں ہوا۔ عبد المَلِک بن مَروان کے بعد ان کے چار بیٹے یکے بعد دیگرے خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔ عبد الملک بن مروان نے اپنے بعد اپنے بیٹے ولید بن عبدالملک اور ان کے بعد دوسرے بیٹے سلیمان بن عبدالملک کے حق میں ولی عہدی کی وصیت کی تھی۔ (تاریخِ شاکر، ج:۴، ۱۸۴، ۱۸۳، طبری، ابنِ کثیر، الدولة الأموية للصلابي، ج:۲)

عہدِ ولید بن عبدالملک (۸۶ھ۔۹۶ھ)

عبدالملک کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ولید بن عبدالملک بن مروان خلیفہ بنے۔ ان کا دور دس سال پر محیط ہے۔ انھوں نے جامع دمشق کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو مدینے کا گورنر بنایا اور سابقہ گورنر کے مظالم کی تلافی کا حکم دیا۔ ولید بن عبدالملک بن مروان کے دور میں مسلمہ بن عبدالملک روم کے مختلف شہروں پر حملہ آور ہوتے رہے۔ ان کے معاونین میں عباس بن ولید بن عبدالملک، عبدالعزیز بن ولید بن عبدالملک تھے۔ ۸۷ ہجری میں بھی انھوں نے بعض قلعے فتح کیے۔ ۸۸ ہجری میں انھوں نے طوانہ کا قلعہ فتح کیا جو قسطنطنیہ کے نزدیک ایک علاقہ تھا۔ ۸۹ ہجری میں مسلمان چھوٹے چھوٹے قلعے اور علاقے فتح کرتے عمُّوریہ (موجودہ انقرہ) کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں شمعون نامی حاکم تھا۔ جب شمعون کو مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس نے ورسیب نامی امیر کو چالیس ہزار کا لشکر دے کر مسلمانوں کے مقابلے پر روانہ کیا تاکہ محاصرے سے پہلے ہی ٹکرا جائیں۔ مسلمہ نے عبداللہ البطال کو دس ہزار کا لشکر دے کر بھیجا۔ گھمسان کا رن پڑا اور رومیوں کو شکست ہوئی۔ ان کے اکثر فوجی قتل ہوئے، یہاں تک کہ سپہ سالار ورسیب بھی مقتول ہوا۔ اب شمعون خود اسی ہزار فوج لے کر مسلمانوں کے مقابلے پر آیا۔ ادھر سے مسلمہ خود مقابلے میں آگے بڑھے۔ یہ ایک خوفناک لڑائی تھی کہ جس میں مسلمانوں کے کمانڈار محمد بن مروان بھی زخمی ہو گئے۔ آخر کار مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ مخالف سپہ سالار شمعون قتل ہوا۔ اگلے سالوں میں بھی ان کمانداروں کا جہاد رومی علاقوں میں جاری رہا اور انھوں نے کئی علاقے مثلاً

ہِرَقلہ اور قمودیہ وغیرہ فتح کیے۔مسلمہ بن عبد الملک نے ۹۶ ہجری میں بھی روم پر حملہ کیا اور طولس وغیرہ کے علاقے فتح کیے۔اس دوران مفتوحہ علاقوں میں کامیاب بغاوتیں بھی ہوتی رہیں اور رومیوں کی طرف سے جوابی کاروائیوں کے طور پر حملے بھی ہوتے رہے جن کے نتیجے میں کئی بار ایک شہر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جاتا اور وہ دوبارہ اسے فتح کرتے۔اس طرح کئی شہر ایک سے زیادہ بار فتح کیے گئے۔(تاریخِ شاکر، ج:۴، ص:۲۰۱، ۲۰۲)۹۶ ہجری میں ولید بن عبد الملک روم پر ایک بڑے حملے کی تیاری میں تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

عہدِ سلیمان بن عبد الملک بن مروان

ولید بن عبد الملک بن مروان کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق سُلَیمان بن عبد الملک بن مروان خلیفہ بنائے گئے۔ سلمان بن عبد الملک ایک نیک شخص تھے۔امورِ سلطنت میں اپنے بھتیجے عمر بن عبد العزیز سے مشاورت کیا کرتے تھے۔انھوں نے کئی اصلاحات کیں۔انھوں نے اقامتِ نماز کا خاص اہتمام کیا۔ناحق جیل کاٹنے والوں کو آزاد کیا اور ظالم گورنروں کو تبدیل کیا۔ان کے دور میں بھی روم کے ساتھ جہاد جاری رہا۔بازنطینی تخت ان دنوں سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور سیاسی انتشار عام تھا۔یہاں تک کہ بیس مہینوں میں ۶ حکمران تبدیل ہوئے۔چنانچہ حالات کو سازگار دیکھ کر خلیفہ فتحِ قسطنطنیہ کی جانب متوجہ ہوئے اور انھوں نے اپنے پیش رو، ولید بن عبد الملک کے قسطنطنیہ پر حملے کے منصوبے کو عمل میں لانے کا ارادہ کیا۔اس مہم کے سالار مسلمہ بن عبد الملک تھے۔ان کے اپنے بیٹے، محمد بن مسلمہ بن عبد الملک، خلیفہ کے بیٹے داؤد بن سلیمان، خلیفہ کے بھتیجے، محمد بن عبد العزیز بن مروان اور خلیفہ کے چچا محمد بن مروان بن حکم بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ بہت سارے نامی گرامی مسلمان مثلاً خالد بن معدان، مجاہد بن جبر، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب، عبداللہ بن عدی بن حاتم طائی، سلیمان بن ابی موسیٰ اشعری، عبداللہ بن جریر بن عبداللہ بجلی، محمد بن خالد بن ولید مخزومی اور مسلمہ بن حبیب بن مسلمہ فہری بھی اس لشکر کا حصہ تھے۔شام کے برّی راستے سے ایک لاکھ بیس ہزار پر مشتمل لشکرِ جرار بھیجا گیا جبکہ بحری فوج کی روانگی اہلِ مصر اور افریقہ کی طرف سے کی گئی جو ایک ہزار جنگی کشتیوں پر مشتمل تھی۔خلیفہ اس مہم میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔بیت المقدس سے اس لشکر کو روانہ کرنے کے بعد وہ مرج دابق نامی مقام پر رہے اور یہ

عزم ظاہر کیا کہ جب تک قسطنطنیہ کی فتح کی خبر نہ ملے گی دمشق نہ جاؤں گا۔ اناضول (اناطولیہ، ایشیائے کوچک) کے علاقے مرعش کا رہنے والا ایک عربی دان رومی حاکم، الیون قیصرِ روم کے ساتھ اپنی دشمنی کی یقین دہانی کراتے ہوئے مسلمانوں کا بظاہر حمایتی اور اس مہم میں ان کا مدد گار بن گیا۔ مسلمہ نے اکثریت کی مشاورت کے مطابق اور مسلمہ بن حبیب کی رائے کے برعکس الیون کی درخواست قبول کی۔ الیون اپنی فوج کے ہمراہ مسلمانوں سے پہلے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت روم پر قیصر تھیوڈوسیوس ثالث کی حکومت تھی جو ایک کمزور حاکم تھا۔ ایک روایت کے مطابق الیون بعض رومی دستوں کو شکست دے کر اور ایک روایت کے مطابق صلح اور سفارت کاری کی آڑ میں قسطنطنیہ پہنچا اور اس نے اکابرینِ سلطنت کو باور کرایا کہ میں اپنی مضبوط فوج کے ساتھ دار الحکومت کا دفاع کر سکتا ہوں اور قیصر اس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس ساز باز کے نتیجے میں قیصر کو معزول کر کے وہ لیو ثالث کے نام سے خود قیصر کے تخت پر بیٹھ کر دفاعی انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ جب مسلمان قسطنطنیہ پہنچے تو ان پر الیون کی چال بازی کا انکشاف ہوا۔ محاصرے کے کچھ عرصہ بعد لیو ثالث نے مسلمانوں سے سفیر بھیجنے کی درخواست کی۔ مشہور کماندار عبد اللہ بطّال بطورِ سفیر پہنچے۔ لیو ثالث نے کچھ رقم تاوان کے طور پر ادا کر کے مسلمانوں سے محاصرہ ترک کر کے واپس اپنے علاقوں میں جانے کی درخواست کی۔ بطال نے اس کی درخواست کو رد کیا۔ لیو ثالث نے ان کے کھانے کے لیے انواع و اقسام کے کھانے منگائے اور کہا کہ تم لوگوں کو استعمال کی جو چیز چاہیے ہو لے سکتے ہو۔ بطال نے کہا کہ اور تو کچھ نہیں چاہیے، خندق کے پیچھے سے ایک مٹھی بھر مٹی دے دیں۔ لیو ثالث نے غصے میں آکر سفیروں کو واپس چلے جانے کا حکم سنایا۔ اس کے بعد لیو ثالث نے مسلمانوں کی بحری فوج کے کماندار عمیر بن ہبیرہ کی خدمت میں بھی ایک سفارتی مہم ارسال کی جو ناکام رہی۔ اس کے بعد لیو ثالث نے صقالبہ کے حاکم برجان سے مدد طلب کی جو ایک لشکر لے کر آیا۔ ابتدائی طور پر مسلمانوں کے ایک دستے سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں برجان کو فتح نصیب ہوئی اور کثیر تعداد میں مسلمان شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔ بہت ساروں کو قیدی بنایا گیا اور ایک قلیل تعداد بچ کر واپس آنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کاروائی کے بعد برجان واپس لوٹ گیا۔ اب عبیدہ بن قیس اور ان کے بیٹے شرحبیل بن عبیدہ کو ایک لشکر دے کر مقابلے پر روانہ کیا گیا جو صقالبہ پر حملہ آور ہوا۔ یہاں گھمسان کا رن پڑا۔ بالآخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور برجان واصل

جہنم ہوا۔ یہاں شرحبیل بن قیس کو شہادت نصیب ہوئی۔ یہ لشکر مسلمان قیدیوں کو چھڑانے اور برجان کو سزا دینے کے بعد دوبارہ محاصرے پر پہنچ گیا۔ محاصرہ طول پکڑ تا جارہا تھا۔ رومی شہر کی فصیلوں کے اوپر سے مسلمانوں پر حملے کرتے۔ کبھی آگ کے گولے برساتے، بعض اوقات جنگی کشتیوں سے حملہ آور ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان بہادری سے ان کا مقابلہ کرتے لیکن شہر کی دیواروں میں نقب یا شگاف یا کسی اور ذریعے سے شہر میں داخلے کا مسلمانوں کو کوئی موقع نہ مل سکا۔ اس سال برف باری معمول سے زیادہ ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق سو دن اور بعض روایات کے مطابق ۱۲ ہفتے برفباری جاری رہی۔ موسم کی اس خرابی سے مسلمان سخت مصیبت کا شکار ہوئے۔ راستوں کی بندش کی وجہ سے مسلمانوں کو امداد بھی نہ پہنچ سکی۔ ان کی خوراک کے ذخائر ختم ہو گئے۔ ان کے جانور مرنے لگے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کو درختوں کے پتے کھانے پڑے اور بعض روایات کے مطابق مردار کھانے کی نوبت بھی آگئی۔ خلیفہ سلیمان بن عبد الملک ان دنوں شمالی شام کے علاقے دابق میں مقیم تھے تاکہ بوقتِ ضرورت مسلمہ کی مدد کر سکیں۔ انھوں نے یہ عزم کر رکھا تھا کہ قسطنطنیہ فتح کیے بغیر واپس نہ ہوں گے۔ جب مسلمہ نے مدد مانگی تو اندازہ ہوتا ہے کہ موسم کی خرابی اور برف باری کی وجہ سے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ انھی دنوں خلیفہ سلیمان بن عبد الملک شدید بیمار ہو گئے۔ بیماری کے دوران انھوں نے حضرت رَجا بن حَیْوۃ سے مشاورت کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز کو اپنا ولیِ عہد مقرر کیا، البتہ اس اندیشے کے تحت کہ شاید بنو امیہ اس فیصلے کو قبول نہ کریں، حضرت عمر بن عبد العزیز کے بعد یزید بن عبد الملک کو ولیِ عہد بنا دیا۔ سلیمان اسی علاقے میں فوت ہوئے اور اسی علاقے میں مدفون ہوئے۔

عہدِ حضرت عمر بن عبد العزیز بن عبد الملک بن مروان

آپ کے والد عبد العزیز ایک صالح شخص تھے۔ آپ کی والدہ لیلیٰ بنت عاصم بن عمر بن خطاب تھیں۔ آپ کی پیدائش ۶۱ ہجری کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔ بچپن ہی میں قرآن پاک حفظ کیا۔ آپ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کثرت سے حاضر ہوتے اور اپنی والدہ سے کہتے کہ میں ان جیسا بننا چاہتا ہوں۔ جب آپ کے والد کو مصر کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تو سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو اپنے پاس روک لیا۔ جس سے آپ کے والد عبد العزیز اور

دادا عبد الملک بن مروان بہت خوش ہوئے۔ بعد میں جب آپ کچھ عرصے کے لیے مصر گئے تو آپ کے والد نے آپ کو واپس مدینہ بھیج دیا تاکہ وہ مدنی ماحول میں تربیت پاسکیں۔ آپ کے والد نے آپ کو صالح بن کیسان رحمہ اللہ کی شاگردی میں دیا۔ اس کے علاوہ آپ نے مدینہ کے بہت سے اہلِ علم سے استفادہ کیا۔ بہت سارے تابعین کے علاوہ آپ تین صحابہ حضرت انس بن مالک، حضرت سائب بن یزید اور حضرت یوسف بن عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ ۸۶ ہجری میں آپ کو مدینہ کا گورنر بنایا گیا۔ آپ نے مدینہ کے دس فقہا کو جمع کیا اور کہا کہ میں سلطنت کے امور آپ کے مشورے سے چلایا کروں گا اور پھر اس کا اہتمام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ آپ حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی رائے کا بھی بہت احترام کرتے تھے۔ آپ ۹۳ ہجری تک مدینہ کے حاکم رہے۔ اس دوران آپ نے ولید کے حکم سے مسجدِ نبوی کی توسیع کی اور مدینہ منورہ کی عام تعمیر و ترقی کا اہتمام کیا۔ آپ سلیمان بن عبد الملک کے مشیر خاص رہے اور انھی کی وصیت سے خلیفہ بنے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز ریاست میں بہت ساری خرابیاں دیکھ رہے تھے، جن کی اصلاح ضروری تھی۔ چنانچہ آپ نے داخلی اصلاحات کی طرف توجہ کی اور بہت سارے اصلاحی کارنامے سرانجام دیے جن کے بیان کے لیے پوری کتاب کی ضرورت ہے۔ اس اصلاحاتی منصوبے کے لیے درکاریکسوئی کی وجہ سے آپ فی الوقت مملکت کی حدود کی مزید توسیع کے حق میں نہ تھے۔ آپ نے جلد ہی قسطنطنیہ کے محاصرے سے فوجوں کو واپس بلانے کا ارادہ کیا۔ آپ نے عمرو بن قیس سکونی کو چار ہزار کی ایک فوج دے کر قسطنطنیہ کی جانب روانہ کیا جو بالآخر لشکرِ اسلام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ لشکر بہت سا اہم سامان لے کر آیا تھا۔ اسی کے ہاتھ خلیفہ نے مسلمہ بن عبد الملک کو محاصرہ ختم کرنے کا حکم دیا۔ باوجود شدید مشکلات کے مسلمہ بن عبد الملک کے حوصلے بلند تھے۔ انھوں نے جواب میں لکھ بھیجا کہ ہم بہار کی آمد کے منتظر ہیں اور بہار نزدیک ہی ہے۔ ہم یہاں سے ٹلنے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ فرما دے۔ لیکن خلیفۂ محترم حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے سپہ سالار کی اس بات کو نہیں مانا اور واپسی کا حکم دوبارہ دے دیا۔ راجح قول کے مطابق یہ محاصرہ ۹۷ھ میں شروع ہوا اور ۹۹ ہجری میں اختتام پذیر ہوا۔ (الحملة الأخيرة على القسطنطينية في العصر الأموي، سلیمان بن عبد اللہ، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ)۔ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی فوجی پالیسی، فوجی کمانڈروں کو جاری اس

حکم سے ظاہر ہوتی ہے: لا تغزو و تمسکوا بما فی ایدیکم۔" چڑھائیاں نہ کرو بلکہ جو علاقے تمھارے ہاتھوں میں آ چکے انھیں اچھی طرح تھامے رکھو"۔ آپ نے سرحدوں کی حفاظت کا خاص اہتمام کیا۔ آذر بائیجان پر غیر مسلم ترک قبائل نے حملہ کیا تو آپ نے حاتم بن نعمان باہلی کی سرکردگی میں لشکر روانہ کیا جس نے ترکوں کی سرکوبی کی۔ آپ نے بعض ساحلوں اور سرحدوں پر قلعے تعمیر کیے تاکہ حملوں کو روکا جا سکے۔ آپ نے بعض مظلوم مسلمان قیدیوں کو چھڑانے کے لیے شاہِ روم کو حملے کی دھمکی دی جس کے نتیجے میں قیدی چھوڑ دیے گئے۔ رجب ۱۰۱ ہجری میں چالیس سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا (الدولۃ الامویہ الصلابی، ۲، ۲۹۸، ۳۰۰، ۳۷۸)

عہدِ یزید بن عبد الملک بن مروان (۱۰۱ھ تا ۱۰۵ھ)

حضرت عمر بن عبد العزیز کے انتقال کے بعد، سلیمان بن عبد الملک کے مقرر شدہ ولی عہد، یزید بن عبد الملک بن مروان خلیفہ بنے۔ ابتدا میں انھوں نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے نقوشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن مختلف اسباب سے پسپائی اختیار کرتے ہوئے بالآخر عام اموی حکمرانوں کے طریقے پر آ گئے۔ ان کے دور میں ماوراالنہر، اندلس، آرمینیا، آذر بائیجان اور افریقہ وغیرہ میں جہاد جاری رہا۔ اندلس میں مصروفِ جہاد فوجوں نے یورپ (موجودہ فرانس) کے علاقے طولوشتہ اور قرقوشنہ وغیرہ کے علاقے فتح کیے، سلطنتِ روم کے ساتھ زیادہ تر معاملہ سرحدات کی حفاظت اور نگہبانی تک رہا البتہ ایشیائے کوچک میں کئی محاذ برپا رہے اور کئی علاقے فتح ہوئے۔ افریقہ کی طرف سے مسلمانوں کی بحری فوجوں نے حملہ آور ہو کر مختلف جزائر فتح کیے۔ البتہ بازنطینی ریاست یا قسطنطنیہ پر براہِ راست کسی حملے سے یہ دور خالی ہے۔ (الدولۃ الامویہ الصلابی، ۲، ۲۹۸) یزید بن عبد الملک کے بیٹے ولید بن یزید بن عبد الملک، باپ کے انتقال کے وقت چھوٹے تھے۔ اس لیے خلیفہ نے اپنے بھائی ہشام بن عبد الملک کو ولیِ عہد بنایا۔ البتہ ان کے بعد اپنے بیٹے ولید بن یزید کو ولیِ عہد مقرر کیا۔

عہدِ ہشام بن عبد الملک بن مروان (۱۰۵ھ ۱۲۵ھ)

۱۰۵ ہجری میں ہشام بن عبد الملک بن مروان خلیفہ بنے۔ ہشام بن عبد الملک ایک نیک اور انصاف پسند شخص تھے

یہاں تک کہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کو بھی قاضی کی عدالت میں پیش کر دیا کرتے تھے۔ عوام کی خدمت اور اہلِ علم کی عزت کرنے والے تھے۔ کمی کوتاہیوں کے باوجود ان کے دور میں حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور کی ایک جھلک نظر آتی تھی۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کی تربیت کے لیے امام ابنِ شہاب زہری کی خدمات حاصل کیں۔ ہشام کے دورِ حکومت میں روم کے ساتھ جہاد جاری رہا۔ مسلمہ بن عبد الملک اور عبد اللہ بطال کے علاوہ خلیفۂ وقت ہشام بن عبد الملک کے بیٹے، ابراہیم بن ہشام، معاویہ بن ہشام، مسلمہ بن ہشام اور سلیمان بن ہشام ان مہمات کے اہم کماندار تھے۔ ان مہمات میں سلطنت کی حدود کی توسیع تو نہ ہوئی البتہ ان مہمات نے رومیوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔ ۱۰۸ ہجری میں قیصریہ شہر فتح ہوا۔ ۱۱۲ ہجری میں خرشنہ کا قلعہ فتح کیا گیا۔ ہشام کے دورِ حکومت میں مسلمان فرانس کے وسط تک چلے گئے جہاں ۱۱۴ ہجری کو انھیں بلاط الشہدا کے معرکے میں شکست کا سامنا کر کے پسپا ہونا پڑا۔ ۱۲۳ ہجری میں ایک رومی فوج نے ملطیہ کے علاقے میں داخل ہو کر شہر پر قبضہ کر لیا جو کچھ ہی عرصے کے بعد ہشام بن عبد الملک نے آزاد کروا لیا۔ ہشام نے سلطنت کی حدود کو محفوظ بنانے کی بھی کوشش کی اور سرحدات پر قلعے قائم کیے۔ اس کے علاوہ ماوراء النہر کے علاقوں میں فتوحات جاری رہیں۔ آرمینیا وغیرہ میں بھی جہاد جاری رہا۔ ہشام بن عبد الملک اپنے بعد کے ولیِ عہد ولید بن یزید کے کردار سے مطمئن نہ تھے اور اسے تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ ابنِ شہاب زہری کی رائے بھی یہی تھی لیکن بعض خاندانی امور کے سبب ہشام ولیِ عہد کو تبدیل نہ کر سکے۔ ۱۲۵ ہجری میں ہشام کا انتقال ہوا جس کے بعد ولید بن یزید بن عبد الملک خلیفہ بنے۔

عہدِ ولید بن یزید بن عبد الملک بن مروان (۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ)

کہا جا سکتا ہے کہ سلطنتِ اموی کے خاتمے کی داغ بیل ولید بن یزید ہی نے ڈالی۔ اگرچہ اس نے عوام کی فلاح و بہبود پر بہت توجہ دی۔ لیکن وہ دینی امور میں تساہل اور فسق و فجور کا مرتکب تھا۔ اس کے علاوہ وہ کینہ پرور اور منتقم مزاج تھا۔ چونکہ ہشام اس کو ولیِ عہد کے منصب سے ہٹانا چاہتا تھا اور اس نے اس بابت بہت سے لوگوں سے مشاورت کی تھی لہٰذا برسرِ اقتدار آنے کے بعد ولید نے ہشام کے خاندان اور ہشام کی رائے کے موافقین کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کیں۔ اپنے اقتدار کے بالکل شروع میں ولید بن یزید نے اپنے نابالغ بیٹے حکم اور عثمان کے لیے بیعتِ ولیِ عہدی لینے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ ولیِ

عہدی، اپنی شرائط کے مطابق ایک جائز امر ہے لیکن بنوامیہ میں اسے خاندانی اصول پر استعمال کیا جاتا رہا جو جائز نہیں تھا لیکن اب تک نابالغ کے حق میں وصیتِ ولیِ عہدی کی کوئی مثال نہ تھی اور یہ اس کی ابتدا ہو رہی تھی۔ اس لیے بنوامیہ کے بعض وفادار کمانداروں نے بھی اس سے انکار کیا اور ولید بن یزید نے ان لوگوں پر بھی سختی شروع کر دی۔ اس وجہ سے لوگ اس کے مخالف ہو گئے۔ ان مخالفین نے یزید بن ولید بن عبد الملک کو اپنا سربراہ مان کر تحریک چلائی۔ انھی دنوں فرقۂ قدریہ سر اٹھا رہا تھا۔ ان لوگوں نے بھی انقلابی تحریک کی حمایت و مدد کی۔ ایک دو لڑائیوں ہی میں دمشق پر قبضہ کر لیا اور جمادی الاخریٰ ۱۲۶ ہجری میں خلیفۂ وقت ولید بن یزید بن عبد الملک کو قتل کر دیا۔ ان کارروائیوں نے خلافتِ بنوامیہ کو بہت کمزور کر دیا۔

یزید بن ولید بن عبد الملک (۱۲۶ھ)

یہ انقلابی سرگرمیوں کے سربراہ تھے۔ کامیابی کے بعد ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ ابنِ کثیر وغیرہ نے ان کے عادل و صالح ہونے پر ان کی تعریف کی ہے۔ بعض صوبوں نے ابتدا میں ان کی خلافت سے انکار کیا لیکن آخر کار سب نے ان پر اتفاق کر لیا۔ اپنے پہلے خطبے میں انھوں نے عدل و انصاف کی سربلندی کی بہت سی باتیں کیں لیکن قدرت نے انھیں مہلت نہ دی اور خلافت کے چھے ہی مہینے بعد، ذوالحجہ سنہ ۱۲۶ ہجری میں انھوں نے طاعون کے سبب انتقال کیا۔ انھوں نے اپنے بھائی ابراہیم بن ولید کے حق میں ولیِ عہدی کی وصیت کی۔

ابراہیم بن ولید بن عبد الملک بن مروان (۱۲۷ھ)

ابراہیم کی خلافت مستحکم نہ ہو سکی۔ مروان بن محمد جو مروان بن حکم کے پوتے تھے۔ یہ خلیفہ ولید بن یزید کے حامی اور آرمینیا اور آذربائیجان کے گورنر تھے۔ جب یزید بن ولید نے، ولید کو قتل کر کے خلافت حاصل کی اس وقت سے یزید سے بدلہ لینے کے درپے تھے۔ جس کا موقع انھیں یزید بن ولید کے بھائی ابراہیم بن ولید سے حکومت چھیننے کی صورت میں ملا۔ حمص پر قبضہ کرنے کے بعد یہ دمشق کی طرف بڑھے۔ ابراہیم کو شکست دے کر دمشق میں داخل ہوئے۔ جہاں ان کی خلافت کی بیعت لی گئی۔ مروان ثانی نے ابراہیم کو قتل نہیں کیا۔ وہ بھاگ گیا۔ بعد میں امان دے دی۔ یہ اکثر انھیں ساتھ

رکھتے اور اکرام کرتے۔ ان کی خلافت محض چند مہینے ہی قائم رہی۔

مروان بن محمد بن مروان بن حکم (۱۲۷ھ تا ۱۳۲ھ) یہ مروانِ ثانی بھی کہلاتے ہیں۔ جنگجو، مردِ میدان اور عقل مند انسان تھے۔ ان کا دور پانچ سال پر مشتمل رہا لیکن اس سارے عرصے میں بغاوتیں جاری رہیں۔ پہلے تو حمص، غوطہ، فلسطین کے علاقوں میں بغاوتیں ہوئیں۔ اس کے بعد خارجیوں نے عراق میں شورش برپا کی۔ اسی دوران آلِ جعفر بن ابی طالب میں سے ایک بغاوت منظم کی گئی۔ خاندانِ بنوامیہ انتشار کا شکار تھا۔ مروانِ ثانی اس انتشار کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے دو بیٹوں کی شادی ہشام کی دو بیٹیوں سے کرائی۔ لیکن یہ حربہ کام نہ آیا اور سلیمان بن ہشام بن عبد الملک نے شورش برپا کر دی۔ ان تمام بغاوتوں کو مروانِ ثانی نے کامیابی سے فرو کیا۔ اسی دوران عباسیوں کی خفیہ تحریک نے انقلابی اقدامات شروع کیے۔ انھی کے ہاتھوں بالآخر ۱۳۲ ہجری میں خلافتِ بنوامیہ کا خاتمہ ہوا۔ (المعارک بین الروم والعرب، ص:۱۸)

جاری ہے

* * * * *

مولانا حماد احمد ترک

نائب مدیر، ماہنامہ مفاہیم، کراچی

سفر نامۂ ترکی (۱)

یہ ۱۴ نومبر ۲۰۲۱ء کی صبح ہے۔ جناح انٹرنیشنل ایئرپورٹ، کراچی پر معمول کی آمد و رفت ہے۔ اسی ہجوم میں ہم بھی سامان ادھر سے ادھر دھکیلتے ہم سفر ساتھیوں کے منتظر ہیں اور بقولِ شاعر ہم ''سفرو'' کہاں ہو تم، کے مصداق ان کی تاک میں ہیں۔ بادِ صبا کے جھونکے مسافروں کے استقبال میں پیش پیش ہیں۔ یوں بھی پاکستان کے کسی بھی خطے میں رہنے والے، کراچی کی شب بیدار ہواؤں سے لطف اندوز ہونے کو سعادت جانتے ہیں۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ باقی لوگ بھی پہنچ گئے۔ قافلہ پورا ہوا تو ہوائی اڈے کے داخلی دروازے کی جانب بڑھے۔ سالارِ قافلہ استاذِ گرامی حضرت مفتی اویس پاشا قرنی صاحب دامت برکاتہم ہیں۔ ضروری کاروائی کے بعد ہوائی اڈے میں داخل ہوئے اور نمازِ فجر ادا کر کے انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔ بعض نے تلاوت اور بعض ساتھیوں نے اذکارِ مسنونہ کا ورد شروع کر دیا۔ چائے جو کہ الہامی مشروب اور عظیم نعمتِ خداوندی ہے؛ ضروری تھا کہ اس کا دور چلے۔ اسی دوران پرواز میں داخلے کے لیے اعلان ہوا اور ہم قطار اندر قطار راہداری سے گزرتے ہوئے ترکش ایئرلائن کے جہاز میں داخل ہو گئے۔ انگریزی میں تہنیت قبول کرنے اور ماسک وصول کرنے کے بعد مقررہ نشست پر بیٹھ گئے۔ چھے گھنٹے کی اس پرواز کا ہمارا پہلا تجربہ تھا، اس لیے دل چسپی اور تجسس نے نیند کو کوسوں دور دھکیل دیا تھا۔ بائیں طرف ایک ادھیڑ عمر صاحب تھے جو امریکہ جا رہے تھے۔ ان سے بھی کچھ گفتگو ہوئی۔ اسی دوران فضائی میزبان نے پرواز کی روانگی کا اعلان کیا۔ حفاظتی بند باندھنے کے بعد، بتیاں بجھا دی گئیں۔ جہاز نے حرکت شروع کی۔ سرکنے، رینگنے، چلنے اور دوڑنے کے بعد جہاز نے رن وے کی اختتامی سمت

لپکنا شروع کیا، اور ایک جھٹکے سے زمین کو چھوڑتے ہوئے اوپر کی طرف اٹھ گیا۔ یک لخت نگاہوں نے منظر بھی تبدیل کر دیا۔ وہ آنکھیں جو لمحہ بھر پہلے ہوائی اڈے کی چار دیواری تک محدود تھیں، اب ان میں ایک شہر کا منظر تھا۔ کروڑوں کی آبادی والا روشنیوں کا شہر۔ ادھر جہاز بادلوں میں گم ہوا اور ادھر ہم میدانِ تخیل کی لامحدود وسعتوں میں کھو گئے۔ جس طرح جہاز کے اوپر اٹھنے سے زاویہ ٔ نگاہ بدل گیا تھا اسی طرح اس پرواز میں موجود آٹھ افراد بھی ایک مختلف زاویہ نگاہ رکھتے تھے۔ اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر اس دنیا کو دیکھنے کا عزم کر کے نکلے تھے۔ فاتح فاؤنڈیشن کا یہ قافلہ اگرچہ عدد میں چھوٹا تھا لیکن ان کا ارادہ انھیں پہاڑوں کی ہمسری پر مجبور کرتا تھا۔ آج سے دو سال قبل یعنی ۲۰۱۹ء میں ان اولوالعزم لوگوں نے فاتح فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی تھی۔ فاتح فاؤنڈیشن کے بنانے والوں کی نگاہوں میں عالمِ اسلام کی فلاح و بہبود اور انسانیت کی خدمت کا ولولہ جھلک رہا تھا۔ وہ خود گویا اپنے مستقبل کو نہیں بلکہ دنیا کے مستقبل کو اپنا ہدف بنائے ہوئے تھے۔ بقولِ رسا چغتائی:

جن آنکھوں سے مجھے تم دیکھتے ہو میں ان آنکھوں سے دنیا دیکھتا ہوں

آج ان آٹھ افراد پر مشتمل یہ قافلہ تربیتی دورے پر ترکی جا رہا تھا جس کی سربراہی استاذِ محترم کر رہے تھے۔ عالمِ تخیل نے عالم مادی کی طرف متوجہ کیا تو نظر آیا کہ جہاز ہزاروں فٹ بلندی پر بادلوں کو چیرتا ہوا منزل کی جانب گامزن ہے۔ ہم انھی افکار میں ڈوبے ہوئے تھے کہ فضائی میزبان نے کھانا پیش کرنے کے لیے متوجہ کیا اور ہم ایک بار پھر خیالوں سے حقیقت کی دنیا میں اتر آئے۔ ترک طرز کے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو پانچ گھنٹے کا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ پرواز ہموار چال کے ساتھ رواں دواں رہی اور استنبول کے ہوائی اڈے پر اتر گئی۔ متعلقہ کاروائی کے بعد ہوائی اڈے کے احاطے میں نمازِ ظہر ادا کی۔ طویل راستے عبور کرنے کے بعد باہر آئے اور طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک کشادہ گاڑی میں شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک جگہ ظہرانے کے لیے اترے۔ یہ ترک روایتی کھانوں کے لیے معروف ”کوفتہ جی یوسف“ کی ایک شاخ تھی۔ کھانے میں سلاد، زیتون اور زیتون کے تیل کا استعمال بہت کثرت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کھانے کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی تیار کردہ لسی (جسے وہ آئرن کہتے ہیں) استعمال کی جاتی ہے اور کھانے کے بعد قہوے کا دور چلتا ہے۔ ابتدائی دو دنوں میں تو ترک قہوہ (جسے وہ ترک قہویسی کہتے ہیں) جبراً حلق میں انڈیلا کیے لیکن پھر اس نے ایسا ذائقہ

دیا کہ ایک پیالہ کم لگنے لگا۔ وہاں عموماً پھیکا قہوہ پیا جاتا ہے۔ اگر چینی ڈالنی ہو تو چینی کے منجمد ٹکڑے کاغذ کی پنی میں لپٹے ہوئے رکھے ہوتے ہیں، انھیں استعمال کیا جاتا ہے۔ ظہرانے کے بعد اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہماری رہائش فاتح بلدیسی (بلدیہ) کے ایک محلے ''کاراگمرک'' میں تھی۔ کاراگمرک میں ہماری رہائش گاہ سے قریب ہی فاتح فاؤنڈیشن کا دفتر موجود ہے، جس کی نچلی منزل پر دفتری امور انجام پاتے ہیں۔ درمیانی منزل میں طلبہ کے لیے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہے۔ کچھ دیر قیلولہ کرنے کے بعد نمازِ عصر باجماعت ادا کی گئی، نمازِ مغرب میں کچھ دیر تھی چنانچہ فاتح مرکز کا مختصر سا دورہ کیا گیا۔ استنبول میں جن رہائشی عمارتوں میں جانا ہوا، وہاں ایک بات یکساں نظر آئی کہ ہر کمرے میں ایک ایک ہیٹر (جسے وہ قمبی کہتے ہیں) نصب ہے۔ سارے ہیٹر ایک مرکزی نظام کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔ یہ نظام ایک الماری نما ڈبے پر مشتمل ہوتا ہے جس سے بیک وقت کمروں کے ہیٹر اور غسل خانوں کے گیزر فعال ہو جاتے ہیں۔ فاتح کے دفتر سے باہر آئے تو مغرب کا وقت قریب تھا۔ مغرب کی نماز ''مہرماہ'' مسجد میں پڑھنے کا ارادہ تھا چنانچہ پیدل ہی مسجد کی جانب روانگی شروع ہوئی۔ ترکی میں مسجد کو ''جامی'' کہتے ہیں اور مہرماہ مسجد کو ''مہرماہ سلطان جامی'' کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ استنبول شہر میں سات چوٹیاں ہیں اور ہر چوٹی پر ایک مسجد ہے۔ مہرماہ بھی انھی میں سے ایک ہے جسے مشہور ماہرِ تعمیرات ''معمار سنان متوفی ۱۵۸۸ء'' نے تعمیر کیا۔ معمار سنان عثمانی سلاطین کا سرکاری معمار اور عثمانی طرزِ تعمیر کا ماہر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ معمار سنان مذہباً عیسائی تھا اور اناطولیہ کے ایک عیسائی خاندان کا فرد تھا۔ عثمانی افواج میں ملازمت کی اور اسلام قبول کیا۔ سلطان سلیم کے لشکر میں نمایاں کارکردگی پر پیادہ دستے کی قیادت حاصل کی اور فتحِ قاہرہ میں حصہ لیا۔ بعد میں توپ خانے کا انتظام سنبھالا اور ایران کے خلاف جنگ میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ متعدّد مساجد تعمیر کیں۔ عظیم معمار سنان نے پہلی مسجد ''شہزادہ مسجد'' تعمیر کی۔ معمار سنان کی دیگر مساجد میں سلیمیہ مسجد، سلیمانیہ مسجد، مہرماہ مسجد اسکودار اور مہرماہ مسجد ادرنہ کاپے شامل ہیں۔ مہرماہ مسجد اسکودار کی تعمیر پہلے مکمل ہوئی اور مہرماہ مسجد ادرنہ کاپے کی بعد میں۔ یہ دونوں مساجد شہزادی مہرماہ سلطان کے حکم پر بنائی گئیں۔ ہم نے نمازِ مغرب اسی مسجد میں ادا کی۔ نماز سے قبل ہی مسجد میں داخل ہو چکے تھے۔ اذان کا وقت ہوا تو ایک صاحب نے مؤذن کی عدم موجودگی کے سبب استاذِ محترم کو اذان کی پیشکش کی۔ استاذِ محترم نے

شکریے کے ساتھ ان کی پیشکش کو مسترد کر دیا۔ ہمیں تعجب ہوا کے ایسی مسجد میں اذان کا شرف کیونکر حاصل نہ کیا۔ نگاہوں میں استفہام پا کر حضرت نے فرمایا کہ یہاں صرف اذان ہی نہیں دینی ہوتی، نماز کے بعد بھی نشریات جاری رہتی ہیں۔ خیر، ایک مقامی صاحب نے اذان دی۔ جماعت کھڑی ہوئی تو ایک جواں سال امام نے امامت کرائی۔ مؤذن کی اذان نے تو متاثر کیا ہی تھا، امام صاحب کی قراءت نے بھی صہبائے ایمان کو دوآتشہ کر دیا۔ نماز مکمل ہوئی تو مؤذن نے ترنم کے ساتھ اذکار پڑھنے شروع کیے۔ پھر تمام مقتدیوں کو تسبیحِ فاطمہ (یعنی ۳۳ دفعہ سبحان اللہ، ۳۳ دفعہ الحمدللہ اور ۳۴ دفعہ اللہ اکبر) کا ورد کرایا۔ ذکر کے بعد امام صاحب نے مصری طرز پر قراءت شروع کی اور نہایت خوش الحانی اور عمدگی کے ساتھ قراءت کی۔ ترکی کی جتنی مساجد میں بھی ہم نے نماز ادا کی، سب میں یہ معمول دیکھا کہ فرض نماز کے بعد امام قراءت کرتے ہیں اور تمام ہی ائمہ باقاعدہ فنِ قراءت سیکھے ہوئے تھے جو مختلف لہجوں میں قراءت کرتے تھے۔ نماز کے بعد مسجد کا مختصر دورہ کیا گیا۔

مسجد کے داخلی حصے پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس میں مسجد کی درج ذیل تفصیلات تحریر ہیں:

اس احاطے کو مہرماہ سلطان کی فرمائش پر معمار سنان نے ۱۵۶۵ء میں تعمیر کیا۔ اس احاطے میں ایک مسجد، ۱۷ درس گاہوں پر مشتمل ایک تعلیمی ادارہ، چھوٹے بچوں کے لیے ایک مدرسہ، ایک مقبرہ، ایک فوارہ اور چند دکانیں شامل ہیں۔ مستطیل شکل کی یہ مسجد دو منزلہ ہے۔ وسیع گنبد، ۲۰۴ کھڑکیوں اور ایک منار کے ساتھ یہ مسجد طویل عرصے سے سطوتِ اسلام کا علم تھامے کھڑی ہے۔ ہم مہرماہ مسجد سے باہر آئے اور اسی سڑک پر ذرا آگے بڑھے تو سڑک کے ساتھ ایک قبر نظر آئی۔ معلوم ہوا کے سلطان محمد فاتح کے اکمک چی (نانبائی) کی قبر ہے جن کا انتقال فتحِ قسطنطنیہ سے قبل اسی مقام پر ہوا تھا۔ اسی سڑک سے بائیں طرف کو مڑتے ہیں تو بابِ ادرنہ کا مقام آتا ہے جسے ترکی میں ادرنہ کاپے کہا جاتا ہے۔ یہاں وہ دروازہ موجود تھا جہاں سے بوقتِ فتح؛ سلطان محمد فاتح براستہ ادرنہ قسطنطنیہ میں داخل ہوئے تھے۔ دل چسپی کی بات یہ ہے کہ پورے استنبول میں جابجا عثمانی دورِ حکومت کی یادگاریں موجود ہیں۔ اگر دلوں سے اس دور کی عظمت نکالنے کی جدوجہد کر بھی لی جائے تو بھی قدیم پتھروں کی یہ دیواریں اور عمارتیں سلطنتِ عثمانیہ کے شاندار ماضی کو پکار پکار کر بیان کرتی ہیں۔

ادرنہ کاپے سے فصیلِ قسطنطنیہ کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ عظیم الشان اور مضبوط فصیل، جسے بازنطینی اپنا آخری سہارا

سمجھتے تھے، وہ فصیل آج بھی اسباب پر بھروسہ رکھنے والوں کے لیے، انسانی قوت پر ناز کرنے والوں کے لیے سامانِ عبرت ہے۔ آج نہ ہی دیوارِ قسطنطنیہ کے معماروں کو یاد کیا جاتا ہے اور نہ ہی سومنات کے شہ سواروں کا نام لیا جاتا ہے۔ اگر نام زندہ ہے تو وہ سلطان محمد فاتح کا ہے یا سلطان محمود غزنوی کا ہے، جنھوں نے خدائے واحد و یکتا کے بھروسے پر خود کو باطل سے ٹکرا دیا۔ یہ عظیم فصیل، جو عہدِ صحابہ سے عثمانیوں تک، نجانے کتنے ہی معرکوں کی جولان گاہ اور کتنی ہی داستانوں کی امین ہے، استنبول کے مختلف مقامات سے نظر آتی ہے۔ کہیں سالم اور کہیں شگاف زدہ۔ بشارتِ محمدی ﷺ کے حصول کی خاطر بہت سے سرفروشوں نے اس ناقابلِ تسخیر فصیل سے خود کو ٹکرا دیا لیکن یہ مقدس خِلعت سلطان محمد فاتح کے حصے میں لکھی تھی۔ جب ذکر سلطان محمد فاتح کا چل نکلا ہے تو کیوں نہ سلطان کے مزار پر بھی حاضری کا شرف حاصل کیا جائے۔ ادرنہ کاپے سے ہم اپنا رخ فاتح مسجد کی طرف موڑتے ہیں۔

نمازِ عشا سلطان فاتح مسجد میں ادا کرنے کا ارادہ تھا۔ مسجد جاتے ہوئے بائیں طرف ایک گہری جگہ دکھائی دی۔ بتایا گیا کہ اسے ''چُکر بستان'' کہتے ہیں۔ استنبول کے لیے صاف پانی کی گزر گاہ ہے جس کا پاٹ آگے چل کر تنگ ہو جاتا ہے۔ فاتح بلدیہ کا یہ حصہ بلندی پر واقع ہے، اس لیے پانی کی گزر گاہ کافی نیچے نظر آ رہی تھی۔ ذرا آگے گئے تو یہ گزر گاہ بہت بلندی پر نظر آئی۔ کسی زمانے میں یہ عظیم قسطنطنیہ کے لیے ندی کا کام دیتی تھی۔ بعد میں اسے کھیل کے میدان میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی کنارے چلتے چلتے سلطان محمد فاتح مسجد کے داخلی دروازے تک جا پہنچے۔ مسجد کے دالان میں نظر پڑتے ہی عجیب منظر دکھائی دیا، بلکہ یوں کہیے کہ اس نظارے کی حیرت نے ہمیں چند لمحوں کے لیے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

جاری ہے

*****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

آپ ﷺ کے سماعِ صلاۃ وسلام کے حوالے سے اہلِ سنت والجماعت کا موقف

سوال: بندۂ ناچیز نے عقیدہ حیات النبی ﷺ سے متعلق کچھ تحریری کام کیا ہوا ہے، جسے اب ایک کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ ہے، کتاب میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں انھی کی ترتیب سے درج ذیل استفتا ہے، اگر حل فرمادیں گے تو عنایت ہو گی۔ جزاکم اللہ خیراً

۱۔ اہل سنت والجماعت کے عقائد میں سے سماعِ صلاۃ وسلام (مراد: کیا روضۂ اطہر پر پڑھے جانے والا درود وسلام حضور ﷺ خود سنتے ہیں، اور دور سے پڑھنے جانے والا درود وسلام حضور ﷺ تک فرشتے پہنچاتے ہیں) کا کیا حکم ہے؟

۲۔ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے وقت بارگاہِ رسالت میں شفاعت کا طلب کرنا کیسا ہے؟

۳۔ حج اور عمرے کی ادائیگی کے لیے جانے والے حضرات کو یہ کہنا کہ روضۂ رسول پر حاضری کے وقت بارگاہِ رسالت میں میرا نام لے کر صلاۃ وسلام (مراد درود وسلام) عرض کرتے ہوئے میرے حق میں بھی شفاعت کی درخواست کرنا شرعاً ٹھیک ہے؟

جواب: ۱۔ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر دور سے پڑھا جانے والا درود وسلام فرشتے خدمتِ عالی میں پیش کرتے ہیں اور جو درود وسلام روضۂ اقدس کے پاس کھڑے ہو کر پڑھا جاتا ہے وہ خود جنابِ رسول اللہ ﷺ سنتے ہیں اور اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ صَلَّى عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِي سَمِعْتُهُ، وَمَنْ صَلَّى عَلَيَّ نَائِيًا أَبْلَغْتُهُ». (شعب الایمان، ۱۴۱/۳) ''نبی کریم ﷺ سے روایت ہے جو شخص میری قبر کے پاس درود پڑھے تو اس کو میں سنتا ہوں اور جو دور سے درود پڑھے تو وہ پہنچایا جاتا ہے''۔ عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ لِلَّهِ مَلَائِكَةً سَيَّاحِينَ، يُبَلِّغُونِي مِنْ

أُمَّتِي السَّلَامَ». (السنن الکبری للنسائی،۱۰/۴۲۶)"حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالی کے کچھ فرشتے زمین میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور مجھ تک میری امت کا سلام پہنچاتے ہیں"۔

۲۔روضۂ اقدس پر پہنچ کر اپنے لیے شفاعت طلب کرنا جائز اور مستحسن عمل ہے۔

۳۔نبی کریم ﷺ کے روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے جانے والے سے اپنا سلام پیش کرنے کی درخواست کرنا جائز ہے۔

ثم انهض متوجها إلى القبر الشريف فتقف بمقدار أربعة أذرع بعيدا عن المقصورة الشريفة بغاية الأدب مستدبرا القبلة محاذيا لرأس النبيﷺووجهه الأكرم ملاحظا نظره السعيد إليك وسماعه كلامك ورده عليك سلامك وتأمينه على دعائك وتقول: السلام عليك يا سيِدي يا رسولَ الله، السلام عليك يا نبيَ الله، السلام عليك يا حبيبَ الله، السلام عليك يا نبيَ الرحمة، السلام عليك يا شفيعَ الأمة---يا رسول الله نحن وفدُك وزوارُ حرمِك، تَشَرَّفنا بالحلول بين يديك، وقد جئناك من بلاد شاسعة وأمكنة بعيدة نقطع السهل والوعر بقصد زيارتك لنَفُوْزَ بشفاعتك والنظر إلى مآثرك ومعاهدك والقيام بقضاء بعض حقك والاستشفاع بك إلى ربنا فإن الخطايا قد قصمت ظهورَنا والأوزارُ قد أثقلت كواهلَنا وأنت الشافع المشفع الموعود بالشفاعة العظمى والمقام المحمود والوسيلة وقد قال الله تعالى:﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللهَ تَوَّابـًا رَحِيمـًا﴾ وقد جئناك ظالمين لأنفسنا مستغفرين لذنوبنا فاشفع لنا إلى ربك واسأله أن يُميتنا على سننك وأن يحشرنا في زمرتك وأن يوردنا حوضك وأن يسقينا بكأسك غير خزايا ولا ندامى الشفاعة الشفاعة الشفاعة يا رسول الله----سلام من أوصاك به فتقول: السلام عليك يا رسولَ الله من فلانِ بن فلان يتشفع بك إلى ربك فاشفع له وللمسلمين-(حاشية الطحطاوي على مراقي الفلّاح، شرح نور الإيضاح (ص: ٧٤٧)

* * * *

نصیر ترابی (۱۹۴۵ـ۲۰۲۱ء)
معروف شاعر

اَوقافی علامات

(PUNCTUATIONS)

اَوقافی علامات سے مراد اَوقاف کے وہ نشانات ہیں جو کسی بھی تحریر میں الفاظ کے مابین درج ہوتے ہیں۔ علامت کی وجہ سے جملوں کے اجزا کی تقسیم اور اُن کا باہمی ربط، اِس طرح رونما ہوتا ہے کہ مفہوم کو سمجھنے میں سہولت ہوجاتی ہے۔

اٹھارویں صدی تک اُردو میں قراءت کے لیے اوقاف کا استعمال بالکل ناپید تھا۔ حتٰی کہ جملے کے خاتمے پر بھی کوئی نشان نہیں ہوتا تھا۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں فورٹ ولیم کالج کی شایع کردہ کتابوں میں جملوں کے اختتام پر ستارے کا نشان ملتا ہے۔ یہی نشان سرسید کے ''تہذیب الاخلاق'' میں بھی نظر آتا ہے۔

اُردو میں سب سے پہلے الطاف حسین حالؔی کی کتاب ''یادگارِ غالب'' (۱۸۹۷ء) میں اوقاف کی باضابطہ پابندی کی گئی لہٰذا حالؔی کو علامت منضبط کرنے کے تعلق سے بھی تقدّم کی فضیلت حاصل ہے۔

عبارت میں ''اوقاف بطرز فرنگ'' کی بابت سرسیدؔ نے ''تہذیب الاخلاق'' (جلد۵، یکم رمضان، ۱۲۹۱ھ) میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ یہ مضمون ''مقالاتِ سرسید'' مرتبہ اسماعیلؔ پانی پتی کے حصہ ہفتم میں بھی شامل ہے۔

علامات کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

علامت	اُردو	فرنگی
۔(بشکلِ نقطہ)	ختمہ	Full Stop
،	سکتہ	Comma
؛	وقفہ	Semi Colon
:	رابطہ	Colon
:۔	تفصیلیہ	Colon & Dash
؟	سوالیہ	Interrogation
!	فجائیہ، ندائیہ	Exclamation
( )	قوسین	Brackets
۔	خط	Dash
" "	واوین	Inverted Commas
۔۔۔۔۔۔	زنجیرہ	Hyphen

(شعریات، نصیر ترابی، ص:۱۸)

*****

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان و نائب صدر جامعہ دار العلوم کراچی

نظم: اے وادئ کشمیر!

بسلسلہ 'یومِ یکجہتئ کشمیر'

تو حُسن کا پیکر ہے، تو رعنائی کی تصویر
مخمور بہاروں کے حسیں خواب کی تعبیر
رخشاں ہے ترے ماتھے پہ آزادی کی تنویر
تو جلوہ گہِ نورِ جہاں، نورِ جہاں گیر
اے وادئ کشمیر! اے وادئ کشمیر!

ہر لمحہ مچلتی ہیں ترے من میں بہاریں
مے خانہ در آغوش درختوں کی قطاریں
چشموں کے ترانے ہیں کہ ساون کی ملہاریں
ندیوں میں تری نغمۂ آزادی کی تفسیر
اے وادئ کشمیر! اے وادئ کشمیر!

کیوں تیری فضاؤں پہ اُداسی کے نشاں ہیں
نکھرے ہوئے گلزار بھی کیوں محوِ فغاں ہیں
چشمے ترے کیوں نالہ کش و نوحہ کناں ہیں
کہسار ترے کیوں ہیں جگر بستہ و دِل گیر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

شاید تجھے مسلم کی وفاؤں سے گلِا ہے
فریاد تری سچ ہے، ترا شکوہ بجا ہے
لیکن مرے محبوب وہ وقت آن لگا ہے
گونجے گا فضاؤں میں جب اک نعرۂ تکبیر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

مانا کہ دلوں میں وہ تب و تاب نہیں ہے
اس قوم کی تلوار میں وہ آب نہیں ہے
اب عزمِ مسلماں بھی وہ سیلاب نہیں ہے
گردش میں ہے برسوں سے مری قوم کی تقدیر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

مانا تری مٹی پہ بہت خون بہا ہے
تو نے غم و آلامِ غلامی کو سہا ہے
لیکن مرے ہمدم! مرا دل بول رہا ہے
ہمّت کی حرارت سے پگھل جائے گی زنجیر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

تکبیر کا نعرہ تری عصمت کا امیں ہے
چَھٹنے کو ہے تاریکیٔ غم، مجھ کو یقیں ہے
کیا ظلمتِ شب صُبح کی تمہید نہیں ہے؟
کیا خونِ شفق رنگ نہیں مژدۂ تنویر؟
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

اب وقت ہے سینوں میں عزائم کو جگالیں
ہم جام و سبُو توڑ کے تلوار اٹھالیں
ہر راہِ گلستاں کو کمیں گاہ بنالیں
کمزور ہے، لیکن ابھی ٹوٹی نہیں شمشیر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

ہیں یاد ابھی خالدؓ و طارقؓ کے فسانے
کچھ دور نہیں احمدؒ و ٹیپوؒ کے زمانے
اٹھو، کہ چلیں ظُلم کو دنیا سے مٹانے
پھر زندہ کریں دہر میں یہ اسوۂ شبیرؓ
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

ہم کو ترے شاداب نظاروں کی قسم ہے
جہلم کے دلآویز کناروں کی قسم ہے
پھولوں کی، درختوں کی، چناروں کی قسم ہے
کاٹیں گے ترے پاؤں سے ہر ظُلم کی زنجیر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

سَر حُرمتِ توحید پہ کٹوا کے رہیں گے
ہم کُفر کے طوفان سے ٹکرا کے رہیں گے
طاغوت کے ایوان کو اب ڈھا کے رہیں گے
پیوندِ زمیں ہوگی ہر اک کفر کی تعمیر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

اک غلغلۂ نعرۂ تکبیر اٹھا کر
یہ برقِ تپاں خرمنِ باطل پہ گرا کر
توپوں سے برستے ہوئے شعلوں میں نہا کر
ہم خوں سے لکھیں گے تری آزادی کی تحریر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

دشمن کے عزائم تری مٹّی میں ملیں گے
مدّت سے جو رِستے ہیں ترے زخم، سِلیں گے
اس خاک پہ الفت کے حسیں پھول کھلیں گے
صیّاد جو اب تک تھا وہ بن جائے گا نخچیر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

پھوٹیں گے تری خاک سے پھر نُور کے دھارے
ظلمت کدۂ کفر سے پھر اٹھیں گے شرارے
گونجے گی اذانوں کی صدا ڈل کے کنارے
پھر جاگ اٹھے گی تری سوئی ہوئی تقدیر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

تو خاتمِ دنیا کا اک انمول نگیں ہے
تو حُسن کا مرکز ہے، بہاروں سے حسیں ہے
آسیؔ کی نگاہوں میں تُو فردوسِ زمیں ہے
فردوس تو ہوتی نہیں شیطان کی جاگیر
اے وادیٔ کشمیر! اے وادیٔ کشمیر!

(جون ۱۹۶۵ء)

*****